جلد ۷۸ ستمبر ۱۹۷۲ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ڈاکٹر نذیر احمد شہیدؒ

کے جیل سے لکھے ہوئے تحریکی، تربیتی، اصلاحی اور انقلابی خطوط کا

مجموعہ

بنیان

اِسی ماہ شائع ہو رہا ہے

سائز ۲۲×۱۸/۸ —— قیمت :- سات روپے

خصوصی رعایت : ماہِ ستمبر میں پیشگی چھ روپے بھیجنے والوں کے لیے ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

تحریکی کتب فروش مطلوبہ تعداد سے فی الفور آگاہ کریں۔

ادارۂ افکارِ نَو —— پوسٹ بکس نمبر ۱۱۷۶ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۸	ستمبر ۱۹۷۲ء مطابق رجب ۱۳۹۲ھ	عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور

فی پرچہ ۸۰ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یُوں تو اس ملک پر اُسی روز سے فسطائیت کے منحوس سائے پڑنے شروع ہو گئے تھے جس روز ملک غلام محمد گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی کو توڑا۔ اُس دن کے بعد جو صبح بھی طلوع ہوئی اُس نے ملک کو جمہوریت سے دُور اور فسطائیت سے قریب تر کیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب کے دَور میں حکومت نے قریب قریب سارے فسطائی ہتھکنڈے آزمانے کی کوشش کی مگر کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ مارشل صاحب کے بعد یحییٰ خان بھی انہی ہتھکنڈوں کو برابر استعمال کرتا رہا، یہاں تک کہ آبادی کے لحاظ سے ملک کا نصف سے زاید حصّہ الگ ہو کر دشمن کے قبضے میں چلا گیا۔

ان فسطائی رجحانات اور تجربات کے عبرتناک انجام کو دیکھتے ہوئے اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ ملک کے بہی خواہ اب ان منفی رجحانات اور آگ سے کھیلنے کے تجربات سے پُوری طرح اجتناب کریں گے اور ان کی جگہ وہ دینی رجحانات کو فروغ دیں گے اور جمہوری روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف متوجہ ہونگے مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

توقعات کے یہ خیالی خاکے قلب و نگاہ کو نشاط و آسودگی بخشنے بھی نہ پائے تھے کہ برسرِ اقتدار گروہ کے تشویشناک عزائم کھل کر سامنے آنے لگے اور ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے آدمی پر بھی یہ حقیقت عیاں ہونے لگی کہ اس ملک کے عوام کے ساتھ سخت دھوکہ ہُوا ہے اور جو جماعت "اسلام ہمارا دین اور جمہوریت ہماری سیاست" کے بلند بانگ دعوے لے کر اٹھی تھی وہ اس ملک سے دین کو مٹانے اور فسطائیت کو قائم کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے۔

پیپلز پارٹی کو اسلام سے کسی حد تک تعلقِ خاطر ہے اور وہ دین کی سربلندی کے لیے کس قدر سرگرم عمل ہے اُس کے اندازے کے لیے کسی غیر معمولی فراست اور بصیرت کی ضرورت نہیں۔ جو شخص تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہے اور جو اسلامی تعلیمات سے یکسر بے بہرہ نہیں اور جسے تعصّب یا مفادات کی محبت نے بالکل اندھا نہیں کر دیا اُسے "اسلام ہمارا دین ہے" کے نعرے کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہے اس معاملے میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں اس لیے ہم برسرِ اقتدار جماعت کی اسلامی اور دینی "خدمات" پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے البتہ ہم اس کے فسطائی عزائم کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ اس ملک کے خیر خواہ اچھی طرح جان لیں کہ اس ملک کو کسی خطرناک راہ پر دھکیلا جا رہا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ کسی ملک پر فسطائی نظام کو ایک ہی لگے بندھے طریق سے مسلط نہیں کیا جاتا۔ کبھی کسی ملک کی فوج سارے دستوری ضابطوں کو پامال کرتی ہوئی تختِ اقتدار پر قابض ہو جاتی ہے اور کبھی کسی ملک میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کو اسی حد تک پریشان کن بنا دیا جاتا ہے کہ آزادی کی فضا عوام کے لیے ایک ہولناک عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جس ماحول کو وہ آزادی کا ماحول سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت ایک ایسا ماحول ہے جس میں انہیں تو کوئی آزادی حاصل نہیں البتہ ظلم و استبداد کے دیو انسانی لہو چاٹنے کے لیے یکسر آزاد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود آزادی کی اس بھیانک فضا سے بھاگتا ہے اور اس کی جگہ کسی ایسے قید خانے کے اندر پناہ لینے میں اپنی عافیت سمجھتا ہے جس میں وہ اپنے جسم اور روح کے رشتے کو ذرا اطمینان کے ساتھ قائم رکھ سکے۔

فسطائیت خواہ پہلے طریق سے آئے یا دوسرے طریق سے بہرحال جور و استبداد کا ایک ظالمانہ نظام ہی مسلط کرتی ہے لیکن دوسرے طریق سے لائی ہوئی فسطائیت نتائج کے اعتبار سے کسی قوم کے لیے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے۔ ان دونوں طریقوں سے لائی ہوئی فسطائیت کے مابین نتائج کے لحاظ سے جو فرق ہوتا ہے اُسے اس ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی کو پولیس اچانک پکڑ کر جیل میں ڈال دے اور دوسرے کو اوباش اور بدقماش لوگوں کے ہاتھوں اس قدر ستایا جاتے اور اس کے دل و دماغ میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی زندگی اور عزت و ناموس کے عدمِ تحفظ کا اس قدر شدید احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ خود پولیس سے یہ درخواست کرے کہ اسے اور اُس کے بیوی بچوں کو

قید خانے میں ڈال کر انہیں ان پریشانیوں اور مصائب سے نجات دلائی جائے۔

جس فرد کو اچانک پکڑ کر حوالۂ زنداں کر دیا جاتا ہے وہ بلاشبہ کچھ مدت تک حیران و ششدر تو ضرور رہتا ہے کہ آخر اُس پر یہ اَن ہونی افتاد کیوں پڑی ہے لیکن اُس کے حواس جلد ہی کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اُس کے ذہن کو مفلوج کرنے کے لیے فسطائیت جو ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے وہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن جس شخص کے جسم اور روح کو اس قدر کچوکے دیئے جائیں کہ وہ قید خانے کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دینے پر آمادہ ہو جائے اور قید و بند کی سختیوں کو آزادی کی "برکات" کے مقابلے میں اپنے لیے زیادہ بہتر خیال کرنے لگے اُس سے اس امر کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی بھی ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کی جسارت کرے گا۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے فوجی انقلاب کے ذریعہ اس ملک میں فسطائی نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور جب فوج نے اس خطۂ پاک پر اچانک قبضہ کیا تو ملک کی پُوری آبادی مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اسے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس پر کیا بیتی ہے اور فوج کا وہ سربراہ جسے اس ملک کے عوام نے دفاعِ وطن کا مقدس فرض سونپ رکھا تھا اُس نے کیونکر اُن کی آزادی سلب کر لی ہے۔ دو تین سال تک اُن پر سکتے کا عالم طاری رہا اور وہ خاموشی سے اُن ساری چالوں کو دیکھتے رہے جو ان کے ذہن کو مفلوج کرنے اور آزادی کے احساس سے محروم کرنے کے لیے چلی جارہی تھیں لیکن چونکہ انہوں نے اپنے مستقبل سے یکسر مایوس ہو کر خود اپنی مرضی سے غلامی کا طوق نہیں پہنا تھا اس لیے جلد ہی اُن کے دلوں میں فیلڈ مارشل صاحب کے آمرانہ عزائم کے خلاف ردِّعمل شروع ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور وہ عوام کو اُن کے چھنے ہوئے حقوق دینے پر آمادہ ہو گئے مگر فاشزم کے علمبرداروں کو اصلاحِ حال کی یہ صورت کب گوارا تھی چنانچہ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ملک جمہوریت کی راہ پر آتے آتے پھر فسطائیت کی راہ پر چل نکلا۔

یحییٰ خاں نے حالات کو بہتر بنانے کی قطعاً کوشش نہ کی بلکہ بگڑتے ہوئے حالات کو سرعت کے ساتھ بگاڑنے کا انتظام کیا۔ اُس کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ بات صاف دکھائی دیتی تھی کہ وہ ملک

کی تعمیر کا خواہاں نہیں بلکہ اُس کی تخریب کے درپے ہے اور اس کے باشندوں کو خلفشار کے ذریعے پوری طرح مفلوج کر دینا چاہتا ہے۔

فوجی آمریت کے ذریعے فسطائیت کا تسلط بھی اگرچہ کسی قوم کے لیے کم اذیت ناک تجربہ نہیں ہوتا مگر جو فسطائیت خلفشار، دہشت پسندی، دھونس، دھاندلی، عدمِ تحفظ کے شدید احساس، اور معاشی انصاف کے پردے میں معاشی استحصال اور ناانصافی کے جلو میں آتی ہے وہ نتائج کے لحاظ سے انتہائی تباہ کن ہوتی ہے کیونکہ اس میں پہلے آزادی کے احساسات کو مُردہ کیا جاتا ہے اور پھر اُن کے مدفن پر فسطائیت کا محل تعمیر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے علمبردار عوامی جذبات سے یکسر بے پروا ہو کر انسانوں کو جس طرح چاہتے ہیں استبداد کی چکی میں پیستے ہیں اور انہیں کسی قسم کا کوئی کھٹکا محسوس نہیں ہوتا کیونکہ عوام کے اندر ظلم کے خلاف احتجاج کی قوت تو کیا اُن کے اندر آہ بھرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہتی۔

ہم اسے اپنے ملک کے لیے انتہائی بدقسمتی سمجھتے ہیں کہ وہ قوم جس پر تیرہ برس تک فوجی آمریت کے ذریعے فسطائیت مسلط کرنے کے پیہم تجربات کیے جاتے رہے ہیں اس میں اب خلفشار اور تشدد کے ذریعے اس ظالمانہ نظام کو رواج دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ وہ قوم جو عرصۂ دراز تک فوجی آمریت کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بن چکی ہے اُسے اب عوامی حکومت عوامی مفاد کے نام پر استبداد کی بھٹی میں جھونک رہی ہے تاکہ اس کی انسانیت جھلس کر رہ جائے اور اس کی آرزوئیں اور تمنائیں جل کر خاکستر ہو جائیں اور اس کے اندر کبھی بھی یہ احساس زندہ نہ ہونے پائے کہ وہ ذی روح انسانوں کا گروہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کی خلعت عطا کر کے اس دنیا میں اتارا ہے۔ اس لیے وہ بندوں کی غلامی کے لیے نہیں بلکہ خدا کی غلامی کے لیے پیدا ہوئی ہے اور جو فرد یا گروہ اجتماعی مفاد کے نام پر اس کے انسانی حقوق سلب کرتا ہے وہ اس کا بہی خواہ نہیں بلکہ اس کا دشمن ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی "عوامی آمریت" کی راہ سے فسطائی نظام کو برپا کیا گیا ہے وہاں حکومت اور عوام کے اندر چند پہلو بڑے بڑے نمایاں نظر آتے ہیں:

● برسرِ اقتدار طبقے کی زبان پر ہر وقت عوامی مفاد کا ورد رہتا ہے اور عوام، عوام کے نعرے سن کر لوگوں کے کان پک جاتے ہیں مگر عوام کے لیے سوائے الفاظ کی شعبدہ بازی کے اور کچھ نہیں کیا جاتا اور ان بے چاروں کو صرف طفل تسلیوں پر زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

● دعویٰ تو اس امر کا کیا جاتا ہے کہ حکومت عوام کی ہے مگر عوام کے خلاف سازشیں کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ بے بس بنانے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ حکومت کا مزاج سرتاپا آمرانہ اور جابرانہ ہوتا ہے۔

● فسطائی عزائم رکھنے والی "عوامی حکومت" اس بات کا پورا پورا اہتمام کرتی ہے کہ ایک خاص شخصیت کو قوت و طاقت کا واحد سرچشمہ بنا دیا جائے اور اس کے ساتھ عوام کے ذہنوں میں یہ باطل خیال راسخ کیا جائے کہ یہ شخصیت ہر خطا سے پاک اور منزّہ ہے اور اس سے غلطی کا صدور ممکن ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام زندگی کے ہر معاملے میں قوت کے اس واحد سرچشمے کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور چونکہ اُس کے بارے میں منزّہ عن الخطا ہونے کا تصور بھی قائم ہوتا ہے اس لیے اس کی ہر بات کو حکمِ خداوندی کی سی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ہٹلر کے بارے میں نازی ازم کے علمبردار یہ بات برملا کہا کرتے تھے کہ جو کچھ ہٹلر کہتا اور کرتا ہے اُس میں خدا کی رضا پوری طرح شامل ہے۔

● حکومت کے کاموں میں نمائش کا عنصر بہت زیادہ غالب ہوتا ہے۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے جا رہے ہیں اور عوام جلد ہی جنت ارضی کی نعمتوں سے مالامال ہونے والے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں کچھ نہیں ہوتا۔ عوام اپنے حالات میں کوئی بہتری محسوس نہیں کرتے بلکہ اُنہیں تیزی سے بگڑتا ہوا دیکھتے ہیں۔ حکمرانوں کا زیادہ وقت تقریروں، کانفرنسوں اور بیان بازیوں میں صرف ہوتا ہے اور اصل مسائل کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

● فسطائیت کی علمبردار حکومت ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتی ہے کہ لوگوں کی اجتماعی زندگی زیادہ سے زیادہ خلفشار کی نذر ہو۔ اس لیے وہ ملک کے اندر انتشار پھیلانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ ایسی پالیسیاں بناتی ہے جن سے معاملات سلجھنے کے بجائے الجھتے ہیں اور عوام کے اندر اپنے مستقبل کے بارے میں مایوسی کے احساسات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

● فسطائی نظام دہشت اور غنڈہ گردی کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے اور خوف و ہراس کی مدد سے اپنا تسلّط قائم رکھتا ہے۔

فسطائیت کی کامیابی کا زیادہ تر انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نظام کے داعی قوم کو کس حد تک سطحی جذباتیت کا خوگر بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کیونکہ عوام کے فکری جہاز جس حد تک بے لنگر ہوں گے اسی نسبت سے فسطائیت کے علمبردار طوفان اُٹھا کر انہیں جس طرف چاہیں گے بہا کر لے جائیں گے۔ جس قدر کوئی قوم ذہنی اعتبار سے متوازن اور جذباتی لحاظ سے معتدل ہو گی اسی تناسب سے اس میں فسطائی نظام کا قیام ناممکن ہو گا۔

فسطائیت کی ان چند موٹی موٹی خصوصیات کو سامنے رکھ کر جب ہم پاکستان کے موجودہ حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے لیے اس تلخ حقیقت کا انکار ناممکن ہوتا ہے کہ اس ملک کو بڑی سرعت کے ساتھ فسطائیت کے جہنم کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ جن راہوں سے یہ نظام آتا ہے ان سب راہوں کو نہ صرف کھول دیا گیا ہے بلکہ انہیں اچھی طرح کشادہ بھی بنا دیا گیا ہے تاکہ اس کی پیش قدمی میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہ ہونے پائے، بلکہ ان راہوں میں جو موانع موجود تھے انہیں پوری قوت کے ساتھ ہٹایا جا رہا ہے۔ پھر داخلی طور پر بھی وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے جس سے لوگ فسطائیت کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان صفحات میں ہمارے لیے ان ساری تدابیر کا ذکر تو ممکن نہیں جو اس فسطائی انقلاب کی کامیابی کے لیے اختیار کی جا رہی ہیں۔ ہم یہاں چند چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو حقیقتِ حال معلوم ہو سکے۔

فسطائیت کی کامیابی کی پہلی منزل یہ ہے کہ عوام پریشان فکری اور پریشان نظری کا شکار ہوں۔ اُن کا گوہرِ مقصود ان کی نظروں سے یکسر اوجھل ہو جائے اور انہیں کچھ معلوم نہ ہو کہ انہیں کدھر جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اُن کی حیثیت اُن بھولے بھٹکے تشنہ لب راہیوں کی سی ہو جو ریت کے چمکتے ہوئے ذروں کو اُبلتے ہوئے چشمے سمجھ کر ان کے پیچھے بھاگتے پھریں اور بالآخر نڈھال ہو کر کسی "خضرِ راہ" کے انتظار میں بیٹھ جائیں۔ ہماری قوم میں اس ذہنی انتشار اور تھکن کے اثرات نہایت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ احیائے دین کے مقدس نصب العین اور اسلام کی محبت نے ہمیں ذہنی اعتبار سے یکسوئی اور جذباتی لحاظ سے استحکام اور توازن عطا کر رکھا تھا مگر افسوس کہ ہم نے قوت و طاقت کے اس اتھاہ خزانے کی قطعاً قدر نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری جدوجہد کی کوئی سمت اور صلاحیتوں کا کوئی تعمیری مصرف باقی نہ رہا۔ ہماری اس پریشان نظری

سے دشمنوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور قومیت کے اسلامی تصور کی جگہ ہمارے دلوں میں چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے چھوٹے بتوں کو نصب کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس تبدیلی کے نتائج آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ قوم جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر یہ دعویٰ لے کر اٹھی تھی کہ انسان اور انسان کے مابین رنگ، نسل اور زبان کے امتیازات انسانیت کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں، اُس کے افراد آج خود ان امتیازات کی بنا پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ سندھ میں جو کچھ ہوا ہے۔ کیا اسلام کے رشتۂ اخوت میں منسلک ہونے کے بعد اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔

چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے تصور کے ابھرنے سے ملّت کا شیرازہ منتشر ہونا بالکل ناگزیر ہے اور یہ فکری انتشار لادینی نظاموں کے لیے کھاد کا کام دیتا ہے۔ اگر حکومت کو فسطائی نظام کی جگہ جمہوری نظام نافذ کرنا مطلوب ہوتا تو وہ سب سے پہلے اس ذہنی خلفشار کے تدارک کی فکر کرتی اور نہ صرف اسلام کے بارے میں مثبت طرزِ عمل اختیار کر کے قوم کے اندر ذہنی یکسوئی پیدا کرنے کا سامان کرتی بلکہ اس ملک میں دینِ حق کے خلاف جتنے منفی رجحانات پھیلائے جا رہے ہیں اُن کی یلغار کو روکنے کے لیے ابلاغ عامہ کے سارے ذرائع پوری قوت اور عزم کے ساتھ استعمال میں لاتی تاکہ قوم کے اندر پریشان فکری کے بجائے سلامتیٔ فکر پیدا ہو۔ آپ ریڈیو ٹیلی ویژن کے صرف ایک دن کے پروگراموں کا جائزہ لیں، سرکاری اخبارات کے اداریوں، شہ سرخیوں اور مضامین پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیں تو آپ کو حکومت کے عزائم کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

حکومت نے جس انتشار کے بیج عوام کے ذہنوں میں بوئے ہیں اُس کے تلخ ثمرات قومی زندگی کے ہر گوشے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اربابِ اقتدار نے صرف اس پریشان فکری پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اجتماعی زندگی کے اہم شعبوں میں اصلاحات کے نام پر بعض ایسی تبدیلیاں کی ہیں کہ اُن کے اندر زبردست بگاڑ پیدا ہوا ہے جس نے اجتماعی زندگی کے توازن کو بالکل تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ ان اصلاحات کا مقصد ہی حیاتِ اجتماعی میں خوفناک قسم کا خلفشار پیدا کرنا تھا تاکہ فسطائیت کے لیے حالات کو سازگار بنایا جائے۔ دستور کو دیکھیے تو وہ پریشان نظری کا ایک بھیانک نقشہ پیش کرتا ہے۔ مرکز میں صدارتی نظام نافذ ہے تو صوبوں میں پارلیمانی نظام کی عملداری ہے۔ پھر راگ تو جمہوریت کا الاپا جاتا ہے (باقی ص ۸۳ پر)

تفہیم القرآن

الفیل

(۲)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

تم نے دیکھا نہیں[1] کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟[2] کیا اُس نے اُن کی تدبیر کو[3]
اکارت نہیں کر دیا؟[4] اور اُن پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ[5] بھیج دیتے جو اُن کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے
پتھر پھینک رہے تھے[6] پھر اُن کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہُوا بھوسا[7] ع ۱

---

[1] خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہے، مگر اصل مخاطب نہ صرف قریش، بلکہ عرب کے عام لوگ ہیں جو اِس سارے قصّے سے خوب واقف تھے۔ قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اَلَم تَرَ (کیا تم نے نہیں دیکھا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو نہیں بلکہ عام لوگوں کو مخاطب کرنا ہے (مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں: ابراہیم، آیت ۱۹ - الحج ۱۸ - ۶۵ - النور ۴۳ - لقمان ۲۹ - ۳۱ - فاطر ۲۷ - الزّمر ۲۱)۔ پھر دیکھنے کا لفظ اِس مقام پر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مکّہ اور اطرافِ مکّہ اور عرب کے ایک وسیع علاقے میں مکّہ سے یمن تک ایسے بہت سے لوگ اُس وقت زندہ موجود تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ دیکھا تھا، کیونکہ اِس واقعہ کو گزرے ہوئے چالیس پینتالیس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہُوا تھا۔ اور سارا عرب ہی اس کی ایسی متواتر خبریں دیکھنے والوں سے سن چکا تھا کہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آنکھوں دیکھے واقعہ کی طرح یقینی تھا۔

[2] یہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی تفصیل اس امر کی بیان نہیں کی کہ یہ ہاتھی والے کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کس غرض کے لیے آئے تھے۔ کیونکہ یہ باتیں سب کو معلوم تھیں۔

[3] اصل میں لفظ کَید استعمال کیا گیا ہے جو کسی شخص کو نقصان پہنچانے کے لیے خُفیہ تدبیر کے معنی میں بولا

جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں خفیہ کیا چیز تھی؟ ساٹھ ہزار کا لشکر کئی ہاتھی لیے ہوئے علانیہ یمن سے مکہ آیا تھا، اور اُس نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔ البتہ جو بات خفیہ تھی وہ حبشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر، قریش کو کچل کر، اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوبِ عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ اس غرض کو انہوں نے چھپا رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ اُن کے کلیسا کی جو بے حرمتی عربوں نے کی ہے اس کا بدلہ وہ اُن کا معبد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔

؎ اصل الفاظ ہیں فِی تَضْلِیْلٍ۔ یعنی ان کی تدبیر کو اُس نے گمراہی میں ڈال دیا۔ لیکن محاورے میں کسی تدبیر کو گمراہ کرنے کا مطلب اسے ضائع کر دینا اور اسے اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام کر دینا ہے، جیسے ہم اُردو زبان میں کہتے ہیں فلاں شخص کا کوئی داؤں نہ چل سکا، یا اس کا کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا وَمَا کَیْدُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ "مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی" (المومن-۲۵)۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ "اور یہ کہ اللہ خائنوں کی چال کو کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا" (یوسف-۵۲)۔ اہلِ عرب امرؤالقیس کو اَلْمَلِکُ الضِّلِّیْل "ضائع کرنے والا بادشاہ" کہتے تھے، کیونکہ اس نے اپنے باپ سے پائی ہوئی بادشاہی کو کھو دیا تھا۔

؎ اصل میں طَیْرًا اَبَابِیْلَ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں چونکہ ابابیل ایک خاص قسم کے پرندے کو کہتے ہیں اس لیے ہمارے ہاں لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ابرہہ کی فوج پر ابابیلیں بھیجی گئی تھیں لیکن عربی زبان میں ابابیل کے معنی ہیں بہت سے متفرق گروہ جو پے درپے مختلف سمتوں سے آئیں، خواہ وہ آدمیوں کے ہوں یا جانوروں کے۔ عکرمہ اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بحرِ احمر کی طرف سے آئے تھے۔ سعید بن جُبیر اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے نہ بعد میں دیکھے گئے۔ یہ نہ نجد کے پرندے تھے، نہ حجاز کے، اور نہ تہامہ، یعنی حجاز اور بحرِ احمر کے درمیان ساحلی علاقے کے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ان کی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کُتّے جیسے۔ عکرمہ کا بیان ہے کہ ان کے سر شکاری پرندوں کے سروں جیسے تھے۔ اور تقریباً سب راویوں کا متفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور پنجوں میں دو دو کنکر، تکے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر ایک مدت تک محفوظ رہے۔ چنانچہ ابو نعیم نے نوفل بن ابی معاویہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ کنکر دیکھے ہیں جو اصحاب الفیل پر پھینکے گئے تھے۔ وہ مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر سیاہی مائل سُرخ تھے۔

ابن عباس کی روایت ابو نعیم نے یہ نقل کی ہے کہ وہ چلغوزے کے برابر تھے اور ابن مردُویہ کی روایت میں ہے کہ بکری کی مینگنی کے برابر۔ ظاہر ہے کہ سارے سنگریزے ایک ہی جیسے نہ ہوں گے۔ اُن میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور رہا ہوگا۔

ملے اصل الفاظ ہیں بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ، یعنی سجّیل کی قسم کے پتھر۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل فارسی کے الفاظ سنگ اور گِل کا مُعَرّب ہے اور اس سے مراد وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہو اور پک کر سخت ہو گیا ہو۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سُورۂ ہود آیت ۸۲ اور سُورۂ حِجر آیت ۷۴ میں کہا گیا ہے کہ قومِ لُوطؑ پر سجّیل کی قسم کے پتھر برسائے گئے تھے، اور اُنہی پتھروں کے متعلق سُورۂ ذاریات آیت ۳۳ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ حجارۃ من طین، یعنی مٹی کے گارے سے بنے ہوئے پتھر تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور، جنہوں نے عہدِ حاضر میں قرآن مجید کے معانی و مطالب کی تحقیق پر بڑا قیمتی کام کیا ہے، اِس آیت میں تَرۡمِيۡهِمۡ کا فاعل اہلِ مکہ اور دوسرے اہلِ عرب کو قرار دیتے ہیں جو اَلَمۡ تَرَ کے مُخاطب ہیں، اور پرندوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ سنگریزے نہیں پھینک رہے تھے، بلکہ اس لیے آئے تھے کہ اصحاب الفیل کی لاشوں کو کھائیں۔ اس تاویل کے لیے جو دلائل انہوں نے دیئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالمطلب کا ابرہہ کے پاس جا کر کعبہ کے بجائے اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرنا کسی طرح باور کرنے کے قابل بات نہیں ہے، اور یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ قریش کے لوگوں اور دوسرے عربوں نے، جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے، حملہ آور فوج کا کوئی مقابلہ نہ کیا ہو اور کعبے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہ پہاڑوں میں جا چھپے ہوں۔ اس لیے صورتِ واقعہ دراصل یہ ہے کہ عربوں نے ابرہہ کے لشکر کو پتھر مارے، اور اللہ تعالیٰ نے پتھراؤ کرنے والی طوفانی ہوا بھیج کر اس لشکر کا بھرکس نکال دیا، پھر پرندے اُن لوگوں کی لاشیں کھانے کے لیے بھیجے گئے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، روایت صرف یہی نہیں ہے کہ عبدالمطلب اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرنے گئے تھے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اونٹوں کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اور ابرہہ کو خانہ کعبہ پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام معتبر روایات کی رُو سے ابرہہ کا لشکر محرم میں آیا تھا جبکہ حُجاج واپس جا چکے تھے۔ اور یہ بھی ہم نے بتا دیا ہے کہ ۶۰ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرنا قریش اور آس پاس کے عرب قبائل کے بس کا کام نہ تھا وہ تو غزوۂ احزاب کے موقع پر بڑی تیاریوں کے بعد مشرکین عرب اور یہودی قبائل کی جو فوج لائے تھے وہ دس بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی، پھر بھلا وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتے تھے تاہم اِن ساری دلیلوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور صرف سورۂ فیل کی ترتیبِ کلام کو دیکھا جائے تو یہ تاویل اُس کے خلاف پڑتی

ہے۔ اگر بات یہی ہوتی کہ پتھر عربوں نے مارے، اور اصحاب فیل بھُس بن کر رہ گئے، اور اس کے بعد پرندے ان کی لاشیں کھانے کو آئے، تو کلام کی ترتیب یُوں ہوتی کہ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (تم ان کو پکّی ہوئی مٹّی کے پتھر مار رہے تھے، پھر اللہ نے اُن کو کھائے ہوتے بھُس جیسا کر دیا، اور اللہ نے اُن پر جھُنڈ کے جھُنڈ پرندے بھیج دیئے)۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جھُنڈ بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، پھر اُس کے مُتّصلاً بعد تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ (جو ان کو پکّی ہوئی مٹّی کے پتھر مار رہے تھے) فرمایا ہے، اور آخر میں کہا ہے کہ پھر اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بھُس جیسا کر دیا۔

ے اصل الفاظ ہیں كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ۔ عَصف کا لفظ سُورۂ رحمان آیت ۱۲ میں آیا ہے: وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ "اور غلّہ بھُوسے اور دانے والا"۔ اِس سے معلوم ہوا کہ عصف کے معنی اُس چھلکے کے ہیں جو غلّے کے دانوں پر ہوتا ہے اور جسے کسان دانے نکال کر پھینک دیتے ہیں، پھر جانور اُسے کھاتے بھی ہیں، اور کچھ ان کے چبانے کے دوران میں گرتا بھی جاتا ہے، اور کچھ ان کے پاؤں تلے روندا بھی جاتا ہے۔

ضروری تصحیح

تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۷۴۶، سطر ۳ میں ترجمے کی ایک غلطی ہو گئی ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ موجودہ ترجمہ یہ ہے:

"بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں"

اس کو بدل کر یُوں کر دیا جائے:۔

"بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب موسیٰ اُن کے ہاں آئے"

تفہیم القرآن

قریش

نام پہلی ہی آیت کے لفظ قریش کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اگرچہ ضحاک اور کلبی نے اس کو مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اس کے مکی ہونے پر متفق ہے، اور اس کے مکی ہونے کی کھلی شہادت خود اس سورہ کے الفاظ رَبَّ هٰذَا الْبَيْت (اس گھر کے رب) میں موجود ہے۔ اگر یہ مدینہ میں نازل ہوتی تو خانہ کعبہ کے لیے "اس گھر" کے الفاظ کیسے موزون ہو سکتے تھے؟ بلکہ اس کے مضمون کا سورۂ فیل کے مضمون سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ غالباً اس کا نزول اُس کے متصلاً بعد ہی ہوا ہوگا۔ دونوں سورتوں کے درمیان اِسی مناسبت کی بنا پر سلف میں سے بعض بزرگ اِس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ یہ دونوں دراصل ایک ہی سورۃ ہیں۔ اِس خیال کو تقویت اِن روایات کی بنا پر ملی ہے کہ حضرت اُبیّ بن کعب کے مصحف میں یہ دونوں ایک ساتھ لکھی ہوئی تھیں اور درمیان میں بسم اللہ مرقوم نہ تھی۔ نیز یہ کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ کسی فصل کے بغیر اِن دونوں کو ملا کر نماز میں پڑھا تھا۔ لیکن یہ رائے اِس وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے کہ صحابۂ کرام کی عظیم تعداد کے تعاون سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے جو نسخے سرکاری طور پر لکھوا کر بلادِ اسلام کے مراکز میں بھجوائے تھے ان میں دونوں کے درمیان بسم اللہ درج تھی، اور اس وقت سے آج تک تمام دنیا کے مصاحف میں یہ الگ الگ سورتوں کی حیثیت ہی سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ مزید برآں دونوں سورتوں کا اندازِ بیان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ یہ علانیہ دو الگ سورتیں نظر آتی ہیں۔

تاریخی پس منظر اِس سورۃ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اِس کے مضمون اور سورۂ فیل کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ اعلیٰ قُصَیّ بن کلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ سب سے پہلے قصی نے اُس کو مکے میں جمع کیا اور بیت اللہ کی تولیت اِس قبیلے کے ہاتھ میں آ گئی۔ اسی بنا پر قصی کو مُجَمِّع (جمع کرنے والے) کا لقب دیا گیا۔ اِس شخص نے اپنے اعلیٰ درجہ کے تدبّر سے مکّہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی، اور جملہ اطرافِ عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا جس کی بدولت رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبائل اور تمام علاقوں میں قریش کا اثر و رسوخ قائم ہوتا چلا گیا۔ قُصَیّ کے بعد اس کے بیٹوں عبدمَناف اور عبدالدّار کے درمیان مکّہ کی ریاست کے مناصب تقسیم ہو گئے، مگر دونوں میں سے عبدمناف کو اپنے باپ ہی کے زمانے میں زیادہ ناموری حاصل ہو چکی تھی اور عرب میں اُس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ عبدمناف کے چار بیٹے تھے۔ ہاشم، عبدشمس، مُطّلِب اور نَوفَل۔ ان میں سے ہاشم (عبدالمطّلب کے والد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا) کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور مکّے کی منڈی میں اندرونِ ملک کے تُجّار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلُّط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اس لیے جنوبی عرب سے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اُس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ دوسرے عربی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیتُ اللہ کے خُدّام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ اُنہیں اِس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں ان کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے رہگذر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے اِنہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس اسکیم میں اپنے باقی تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسّانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبدشمس نے، یمنی امراء سے مُطّلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں۔ اِس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے

ترقی کرتی چلی گئی۔ اِسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتجّرین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اور جو روابط انہوں نے گرد و پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے اُن کی بنا پر اِن کو اصحابُ الایلاف بھی کہا جاتا تھا۔

اِس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ اِن بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لیے استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قریش قادۃ الناس "قریش لوگوں کے لیڈر ہیں" (مُسند احمد، مرویاتِ عمرو بن العاص)۔ اور حضرت علیؓ کی روایت بیہقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کان ھٰذا الامر فی حِمیَر فنزعہ اللہ عنہم وجعلہ فی قریش "پہلے عرب کی سرداری قبیلۂ حِمیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے وہ ان سے سلب کر کے قریش کو دے دی"۔

قریش اسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے کہ مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آگیا۔ اگر اُس وقت ابرہہ اِس شہرِ مقدس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں، خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اِس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پُورے ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی، اور قریش اس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَی بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر ابرہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکہ سے یمن تک سارے راستے میں

جگہ جگہ اِس تباہ شدہ فوج کے آدمی گِر گِر کر مرتے چلے گئے تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہلِ عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا، اور اُس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ اِن لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ انہیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔

مقصودِ کلام | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں یہ حالات چونکہ سب ہی کو معلوم تھے اس لیے اُن کے ذکر کی حاجت نہ تھی یہی وجہ ہے کہ اِس سورہ کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم خود اِس گھر (خانہ کعبہ) کو بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر مانتے ہو، اور جب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں اِس گھر کے طفیل یہ امن عطا کیا، تمہاری تجارتوں کو یہ فروغ بخشا، اور تمہیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوشحالی نصیب فرمائی، تو تمہیں اُسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

چونکہ قریش مانوس ہوئے،[۱] (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس،[۲] لہٰذا اُن کو چاہیے کہ اِس گھر کے رب کی عبادت کریں[۳] جس نے اُنہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا[۴] اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔[۵] ع ۱

---

[۱] اصل الفاظ ہیں لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ۔ ایلاف اَلْف سے ہے جس کے معنی خوگر ہونے، مانوس ہونے، پھٹنے کے بعد مِل جانے، اور کسی چیز کی عادت اختیار کرنے کے ہیں۔ اُردو زبان میں اُلفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔ ایلاف سے پہلے جو لام آیا ہے اس کے متعلق عربی زبان کے بعض ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ عربی محاورے کے مطابق تعجب کے معنی میں ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں کہ لِزَیْدٍ وَّمَا صَنَعْنَا بِہٖ، یعنی ذرا اِس زید کو دیکھو کہ ہم نے اِس کے ساتھ کیسا نیک سلوک کیا اور اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ پس لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا رویّہ بڑا ہی قابلِ تعجب ہے کہ اللہ ہی کے فضل کی بدولت وہ منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے اور اُن تجارتی سفروں کے خوگر ہو گئے جو اُن کی خوشحالی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اور وہ اللہ ہی کی بندگی سے رُوگردانی کر رہے ہیں۔ یہ رائے اَخْفَش، کِسائی، اور فرّاء کی ہے، اور اسی رائے کو ابنِ جریر نے ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب جب اِس لام کے بعد کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو وہی بات یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے کہ اُس کے ہوتے جو شخص کوئی رویّہ اختیار کر رہا ہے وہ قابلِ تعجب ہے۔ بخلاف اِس کے خلیل بن احمد، سِیبَوَیہ اور زَمَخشری کہتے ہیں کہ یہ لامِ تعلیل ہے اور اِس کا تعلق آگے کے فقرے فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ سے ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ یُوں تو قریش پر اللہ کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں، لیکن اگر کسی اور نعمت کی بنا پر نہیں تو اِسی ایک نعمت کی بنا پر وہ اللہ کی بندگی کریں کہ اُس کے فضل سے وہ اِن تجارتی سفروں کے خوگر ہوئے، کیونکہ یہ بجائے خود اُن پر اُس کا بہت بڑا احسان ہے۔

[۲] گرمی اور جاڑے کے سفروں سے مراد یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں قریش کے تجارتی سفر شام و فلسطین کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ ٹھنڈے علاقے ہیں، اور جاڑے کے زمانے میں وہ جنوبِ عرب کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ گرم علاقے ہیں۔

۳؎ اِس گھر سے مراد خانۂ کعبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ نعمت اِسی گھر کی بدولت حاصل ہوئی ہے، اور وہ خود مانتے ہیں کہ وہ ۳۶۰ بُت اس کے رب نہیں ہیں جن کی یہ پُوجا کر رہے ہیں، بلکہ صرف اللہ ہی اس کا رب ہے۔ اُسی نے ان کو اصحابِ فیل کے حملے سے بچایا۔ اُسی سے انہوں نے ابرہہ کی فوج کے مقابلے میں مدد کی دعا کی تھی۔ اس کے گھر کی پناہ میں آنے سے پہلے جب وہ عرب میں منتشر تھے تو اُن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ عرب کے عام قبائل کی طرح وہ بھی ایک نسل کے بکھرے ہوئے گروہ تھے۔ مگر جب وہ مکہ میں اِس گھر کے گرد جمع ہوئے اور اِس کی خدمت انجام دینے لگے تو سارے عرب میں محترم ہو گئے، اور ہر طرف ان کے تجارتی قافلے بے خوف و خطر آنے جانے لگے۔ پس انہیں جو کچھ بھی نصیب ہوا ہے اِس گھر کے رب کی بدولت نصیب ہوا ہے، اس لیے اُسی کی اِن کو عبادت کرنی چاہیے۔

۴؎ یہ اشارہ ہے اِس طرف کہ مکے میں آنے سے پہلے جب قریش عرب میں منتشر تھے تو بھوکوں مر رہے تھے۔ یہاں آنے کے بعد اُن کے لیے رزق کے دروازے کھُلتے چلے گئے اور ان کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا حرف بحرف پُوری ہوئی کہ اَے پروردگار، مَیں نے اپنی اولاد کے ایک حصّے کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں، پس تو لوگوں کے دلوں کو اِن کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے (ابراہیم۔ آیت ۳۷)۔

۵؎ یعنی جس خوف سے عرب کی سرزمین میں کوئی محفوظ نہیں ہے اُس سے یہ محفوظ ہیں۔ عرب کا حال اُس دَور میں یہ تھا کہ پُورے ملک میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے ہوں، کیونکہ ہر وقت ان کو یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی غارت گر گروہ اچانک اُس پر چھاپا مار دے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے حدُود سے باہر قدم رکھنے کی ہمت کر سکے، کیونکہ راستے میں جگہ جگہ اُس پر ڈاکہ پڑنے کا خطرہ تھا، اور راستے بھر کے با اثر قبائلی سرداروں کو رشوتیں دے کر تجارتی قافلے بخیریت گزر سکتے تھے لیکن قریش مکہ میں بالکل محفوظ تھے، انہیں کسی دشمن کے حملے کا خطرہ نہ تھا۔ اُن کے چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے قافلے ملک کے ہر حصے میں آتے جاتے تھے، کوئی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ قافلہ حرم کے خادموں کا ہے، انہیں چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ حد یہ ہے کہ اکیلا قریشی بھی اگر کہیں سے گزر رہا ہو اور کوئی اس سے تعرُّض کرے تو صرف لفظ "حرمی" یا اَنَا مِنْ حَرَمِ اللّٰهِ کہہ دینا کافی ہو جاتا تھا۔ یہ سنتے ہی اُٹھے ہوئے ہاتھ رُک جاتے تھے۔

اسلام کے نظامِ حکمرانی میں قیادت کا مقام

از جناب سعد گیلانی صاحب

اسلامی ریاست اور اس میں نافذ نظامِ حکمرانی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور فلاحِ انسانیت ہے اور اس نظم کو چلانے والے لوگوں کا حقیقی فرض اس مقصد کے حصول کی طرف پورے معاشرے کی رہنمائی ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود کو نافذ کریں، نیکیوں کو فروغ دیں اور تمام چھوٹی بڑی خرابیوں اور برائیوں سے معاشرے کو پاک کریں۔

قائدین کے فرائض | اسلامی نظامِ حکمرانی کی قیادت کرنے والوں کے لیے قرآن نے واضح الفاظ میں ان کے فرائض متعین کیے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج۔۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

ظاہر ہے کہ نظامِ صلوٰۃ کا قیام ایک مخصوص نوعیت کے ماحول کا اہتمام اور معاشرے کے کردار کی تشکیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کی فراہمی اور اس کی تقسیم کے لیے بھی ایک مخصوص طرز کا معاشی نظام وجود میں آتا ہے جس میں مساکین، مقروض، اور اہلِ حاجت لوگوں کا خون چوسنے کے بجائے ان کی دستگیری کے مکمل انتظام کا تصور موجود ہے نیکی کا حکم دینے کے لیے ایک ایسے نظامِ قانون کی تشکیل ضروری ہے جو صرف نیکیاں کرنے کی اجازت ہی نہ دے بلکہ نیکی کی پرورش کی ہمت افزائی اور تحفظ وارتقا کے لیے پورا ماحول تیار کرے تاکہ پورا معاشرہ نیکی کا زرخیز کھیت بن جائے جس میں نیکی کرنا سب سے آسان کام ہو۔ اسی طرح بدی سے روکنے کا اہتمام کرنے سے مراد صرف مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور اس کے لیے سزا و تادیب کا انتظام ہی نہیں ہے (اس لیے کہ اسلام کا مزاج سزا و تادیب کو کم سے کم حرکت میں لانا چاہتا

ہے، بلکہ اسلام پورے معاشرے کی ظاہری اور داخلی فضا اس طرح کی بنانا چاہتا ہے جس میں بدی کی پرورش کے تمام راستے بند ہو جائیں اور معاشرے کا پورا ماحول بدی کے راستے میں سنگِ گراں بن جائے۔ یہاں تک کہ بدی کے خیالات کے نشوونما تک کے تمام راستے مسدود ہو جائیں اور معاشرے میں صالحیت اور پاکیزگی تدریج اس طرح چھا جائے کہ نیتوں کا فتور تک اصلاح پذیر ہو جائے جو بدی کی طرف انسان کی پہلی منزل ہے۔

اسلامی نظریاتی مملکت کی چند صفات | اسلام کے تصور پر قائم مملکت ایک نظریاتی اخلاقی نظام کی حامل مملکت ہوتی ہے۔ اس میں حکومت اور حکمرانی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ مملکت کا مقصدِ وجود ان اصولوں کی علمبرداری ہوتا ہے جن اصولوں کا یہ نظام حامل ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ایک صفاتی نظام ہے۔ ان صفات میں سے چند ایک کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

۱۔ اس نظام میں حاکمیتِ اعلیٰ قوم یا چند افرادِ قوم کی نہیں بلکہ خود اللہ رب العلمین کی تسلیم کی جاتی ہے۔ قوم اور اس کے قائدین حاکمیت کی بجائے خلافت کا مقام قبول کر کے اپنے فرائضِ بندگی سرانجام دیتے ہیں۔

۲۔ یہ نظام مشاورت کے اصول پر چلایا جاتا ہے۔ حکومت کا بننا اور بدلنا عوام کی رائے پر موقوف ہوتا ہے، وہ عوام جو خود بھی خدا و رسولؐ کے احکام کے تابع اور پابند ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ ایک نظریاتی نظام ہے جو اس نظریے پر ایمان رکھنے والوں کی معرفت ہی چلایا جا سکتا ہے۔

۴۔ یہ رنگ و نسل اور زبان و علاقہ کی عصبیتوں سے بالاتر نظام ہے جس میں اسلامی عصبیت کے سوا دوسری کسی عصبیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

۵۔ اس نظام میں سیاست اور اس کے تمام تقاضوں کو اخلاق، انصاف، شرافت اور دیانت و امانت کے تابع رکھا جاتا ہے اور اس کی روح خدا ترسی ہوتی ہے۔

۶۔ یہ نیکیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کا استیصال کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔

۷۔ یہاں مساوات اور اخوت کا عملی اہتمام کیا جاتا ہے۔

۸۔ اس نظام میں فرد کو پوری آزادی ہوتی ہے لیکن خدا اور رسول کے بالاتر قانون کے ماتحت، اور حکومت اور اس کے قائدین کو پورے اختیارات ہوتے ہیں لیکن خدا کے بالاتر قانون اور مشاورت کی پابندی

کے ساتھ۔

۹۔ لوگوں کے درمیان عدل کا قیام، مسلمانوں کے اندر مساوات کا فروغ، ذمہ دار جمہوری اداروں اور عوام کے سامنے جواب دہی کا اہتمام۔ انتظام مملکت میں عوام کے نمائندوں کی آراء سے استفادہ، نیکیوں کا فروغ، برائیوں کا استیصال، اقتدار کی ہوس اور کشمکش سے پاک وصاف ماحول اس کی نمایاں خصوصیات ہیں:۔

قائدین کی صفات ظاہر ہے کہ ایسے نظریاتی نظامِ مملکت میں اُس کے چلانے والوں کے لیے بھی کچھ مخصوص صفات سے متصف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر یہ نظام نہیں چل سکتا اور چل پڑے تو اپنے ارتقائی مدارج طے نہیں کر سکتا۔ ان صفات میں سے بھی بعض کا تذکرہ ضروری ہے۔

۱۔ اسلامی نظامِ مملکت چلانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اصولوں کو دل وجان سے مانتے اور ان پر ایمان رکھتے ہوں جن اصولوں پر یہ نظام قائم ہے۔ اِن اصولوں کے مُنکر یا ان سے منحرف لوگ اس نظام کو نہیں چلا سکتے۔ چلائیں تو ان کے ذریعے اسلامی نظامِ مملکت برپا نہیں ہو سکتا۔

۲۔ قیادت پر فائز لوگ خدا ترس، نیک اور ایماندار ہوں۔ ظالم، خدا سے غافل، خواہشات و اغراض کے بندے اور بے عمل نہ ہوں۔

۳۔ وہ معاملہ فہم، دانا، صاحبِ علم اور ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں سے متصف اور اپنے منصب کے لیے ضروری اہلیتوں کے مالک ہوں۔

۴۔ ان کی امانت و دیانت مسلّم ہو، منصبی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوں، اُن کا بوجھ اٹھانے کا احساس رکھتے ہوں اور قابلِ اعتماد کردار کے لوگ ہوں۔

۵۔ ان میں مناصب کے لیے امیدواری اور طلب نہ پائی جاتی ہو۔

طلبِ منصب کی حوصلہ شکنی اسلامی نظامِ مملکت میں قیادت اور مناصب کے لیے طلب کی سخت حوصلہ شکنی کی گئی ہے اس لیے کہ اسی سے وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو کسی نظم کو تباہی سے دوچار کر دیتی ہے اور یہی طلب ادائے فرض کے احساس کو کند اور طلبِ منفعت کے ذوق کو تیز تر کر دیتی ہے جبکہ اسلام کے نظامِ سیاست و حکمرانی میں عہدہ و منصب ذمہ داری کا بھاری بوجھ، نازک ترین اصولوں کے نفاذ کا معاملہ، اور تلوار سے تیز اور بال سے باریک احساس کے ساتھ ادائیگی فرض کا مقام ہے۔ اسی

لیے فرمایا گیا۔

"امام ایک راعی ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی" (حدیث)

پھر اسی حدیث کی تفصیل میں اس راعی اور رعیت کے تصور کو پھیلا کر ذمہ داری کے ہر ہر درجے پر منطبق کیا گیا ہے۔

مزید فرمایا گیا:

"جسے اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا راعی بنائے اور وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں خیانت کا ارتکاب کر کے مرے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنّت حرام کر دے گا۔"

"اللہ کے حضور سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور سب سے زیادہ دُور جگہ پانے والا شخص ظالم امام ہوگا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مِقدام بن مَعدِی کَرِب کے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

"اے قدیم۔ اگر کہیں کے امیر یا منشی یا چوہدری بنے بغیر مر جاؤ تو سمجھو کہ تم نے فلاح حاصل کر لی۔"

اپنے ایک دوسرے صحابی سے فرمایا:

"اے عبدالرحمٰن کبھی امارت کی طلب نہ کرو۔ اگر تمہیں مانگنے سے ملے تو نفس کے پھندوں میں پھنس جاؤ گے۔ اور اگر بے طلب ملے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہوگی۔"

حضورؐ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے عہدے کی درخواست کے جواب میں فرمایا:

"ابوذر! یہ ایک بھاری امانت ہے۔ اور تم ایک کمزور آدمی ہو۔ قیامت کے دن یہ امانت ندامت اور رسوائی کا سبب ہوگی مگر اس شخص کے لیے نہیں جو اس کے حق کے ساتھ اس کو اٹھائے اور اس سلسلہ میں اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوں ان کو ادا کرے۔"

منصبِ عدل کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا:۔

"جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے جج بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔"

حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے وہ قیامت کے دن روکا جائے گا۔ ایک فرشتہ

اس کی پشت پر سر کو پکڑے ہوئے اس کو جہنم کے کنارے پر روکے گا۔ پھر اس کے سر کو اللہ کی طرف اٹھائے گا۔ اگر وہ حکم دے گا کہ اس کو پھینک دے تو وہ اس کو ایک کھڈ میں پھینک دے گا اور وہ چالیس سال کی مسافت کی گہرائی میں گر جائے گا"۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"حاکموں کے لیے ہلاکی ہے۔ چوہدریوں کے لیے ہلاکی ہے۔ متولیوں کے لیے ہلاکی ہے قیامت کے دن بہت سے لوگ ہوں گے جو تمنا کریں گے کہ کاش ان کی چوٹیاں ثریا سے بندھی ہوئی ہوتیں اور آسمان و زمین کے درمیان لٹکے ہوئے ہوتے لیکن کسی ذمہ داری کے عہدے پر مقرر نہ کیے گئے ہوتے"۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ حضورؐ نے فرمایا:

"جو شخص دس یا دس سے زیادہ افراد کے معاملات کا ذمہ دار ہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح آئے گا کہ اس کے ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے پھر یا تو اس کی نیکی اس کو آزادی دلائے گی یا اس کے گناہ اس کو ہلاک کریں گے۔ اس امارت کا آغاز ملامت، اس کا وسط ندامت اور اس کا آخر قیامت کے دن رسوائی ہے"۔

مزید تنبیہ کی گئی کہ:

"ایک زمانہ آئے گا کہ تم لوگ امارت و سرداری کی طمع کرو گے حالانکہ یہ قیامت کے دن ندامت کا سبب ہوگی۔ یہ کیا ہی اچھی دودھ پلانے والی اور کیا ہی بری دودھ چھڑانے والی ہے"۔ (بخاری)

یہ وعیدیں مناصب کی بھاری ذمہ داری کا شدید محکم اور ہر دم زندہ و تازہ احساس رکھنے کے لیے اسلامی نظام حکومت کے کارندوں کو دی گئی ہیں تاکہ عہدہ، جسے دنیا بھر میں منفعت اور مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اسلامی نظام میں بھی اسی مقصد کے لیے استعمال نہ ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان وعیدوں کی موجودگی میں بھی عہدہ طلب کرتا ہے، یا تو اسے آخرت کا ڈر نہیں ہے۔ یا منصب کی ذمہ داری کا پورا پورا شعور نہیں ہے، یا پھر اس کی نیت میں فتور ہے۔ اسی لیے خود عہدے کی طلب کو ہی اس عہدے کے لیے نااہلیت کی دلیل قرار دے دیا گیا ہے۔

دو آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے لیے حکومت کے مناصب طلب کیے۔ آپ نے جواب میں فرمایا۔

"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو کوئی عہدہ طلب کرے۔"

چنانچہ اس کے بعد حضورؐ نے اپنی زندگی میں انہیں کوئی عہدہ و منصب حوالے نہیں کیا۔

اسلامی قیادت کے احساسِ ذمہ داری کی چند جھلکیاں ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کی نظریاتی قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ جب ایسی تنبیہات اور وعیدات بھی موجود ہوں تو کون شخص آسانی سے آگے بڑھنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ چنانچہ دورِ سعادت میں جس کسی پر یہ ذمہ داری پڑی اس پر خدا اور خلق کے سامنے جوابدہی کا احساس اور خوفِ خدا کا غلبہ کچھ ایسا حاوی رہا کہ اس کی رات کی نیندیں اور دن کا آرام حرام ہو کر رہ گیا۔ ایسے لوگ ملت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں کھپ کر ہی رہ گئے۔ ان کے اہلِ خانہ، ان کے خاندان والے۔ ان کے اپنے احباب و عزیز و اقرباء سبھی ان کی ذاتی اور شخصی حیثیت سے محروم ہو گئے۔ ان کا وجود ملت کا اجتماعی سرمایہ بن کر رہ گیا۔ اور وہ فلاحِ انسانیت کے اس کام میں ایسے لگے کہ پھر انہیں کسی دوسری چیز کا ہوش نہ رہا۔

جب پوری امتِ مسلمہ کی قیادت و رہنمائی کا بارِ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ پر پڑا تو انہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا:

"اگر میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دوں تو میری مدد کرنا۔ اور کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ سچائی امانت ہے، جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں جو کمزور ہے وہی میرے نزدیک طاقتور ہے تاآنکہ میں اس کا حق اسے پہنچا دوں۔ اور جو طاقتور ہے وہی میرے نزدیک کمزور ہے تاآنکہ میں اس سے حق وصول کر لوں۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں تم لوگ میری اطاعت کرنا اور اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں۔"

اپنی وفات کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو وصیت حضرت عمرؓ فاروق کو خلافت کی ذمہ داری سونپنے کے بعد کی وہ یہ تھی:۔

"تم پر اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق رات میں ہیں جن کو وہ دن میں قبول نہیں کرے گا اور کچھ

حقوق دن میں ہیں جو وہ رات میں قبول نہیں فرمائے گا۔ وہ نفل قبول نہیں کرے گا جب تک تم فرض نہ ادا کر لوگے۔ اُن لوگوں کی میزان قیامت میں ہلکی ہوگی جنہوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی اور جس میزان میں باطل رکھا گیا اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ ہلکی ہو۔ میں اپنے پیچھے جو عظیم ذمہ داری چھوڑ کر جا رہا ہوں اس کو سامنے رکھ کر میں نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے۔ خدا کی قسم میں کبھی غافل ہو کے نہیں سویا کہ مجھے خواب نظر آتے اور نہ میں نے ہوائی قلعے بنائے کہ میں بہکتا۔ جب تک تم خدا سے ڈرتے رہو گے یہ لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے اور جب تک تم سیدھے راستے پر رہو گے یہ لوگ تمہارے لیے سیدھے رہیں گے۔"

چنانچہ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس منصب کو جس احساس ذمہ داری سے نبھایا اس سے سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان کے دور میں دورِ نبوت کی جھلک غالب تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں نصیحت کی:

"اگر آپ اپنے پیشرو کی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو قمیص میں پیوند لگائیے۔ تہبند اونچی کیجیے۔ جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیجیے۔ جرابوں میں پیوند لگائیے۔ ارمان کم کیجیے اور بھوک سے کم کھائیے۔"

ان لوگوں کے سامنے حضورؐ کا یہ ارشاد موجود تھا کہ

"جس کو اُس کے عمل نے پیچھے رکھا اسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکے گا۔"

اسی لیے قرآن نے مسلمانوں میں بڑائی اور تکریم کا معیار یہ مقرر کیا کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اور اسلامی نظام میں اس کا تصفیہ رائے عامہ کرے گی کہ کون اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ چونکہ اسلام میں وراثت کی خلافت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی وراثتی خلافت کسی معیار کی پابندی کر سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد تقریباً وہی باتیں دُہرائیں جو حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے تقرر کے وقت فرمائی تھیں۔ اور انہی باتوں کا اقرار کیا جن کا انہوں نے اقرار کیا تھا۔

پھر یہ بھی فرمایا:۔

"لوگو میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر مجھے خلیفہ رسول اللہ کی بات ٹھکرانا ناپسند نہ ہوتا تو میں ہرگز تمہارے معاملات کی ذمہ داری قبول نہ کرتا۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنے ذمّے عوام کے حقوق اور اپنی ذمّہ داریوں کو گنوایا اور اپنا معیارِ کفالت بتایا:

"تم مجھ سے اپنے حقوق اور میری ذمّہ داریوں کا مواخذہ کرتے رہنا میں نے اللہ کے مال کو یتیم کے مال کی حیثیت دے رکھی ہے۔ میرے لیے اس میں سے دو کپڑے لینا حلال ہے، ایک جاڑے کے لیے ایک گرمی کے لیے۔ میرے اوپر میرے گھر والوں کی خوراک وہ ہوگی جو قریش کے کسی متوسط گھرانے کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں جو اُن کو ملے گا مجھے بھی ملے گا۔"

جب حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے بھی اپنے پہلے ہی خطبے میں فرمایا:

"سُنو، میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ جان لو کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی پیروی کرنے کے بعد تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کیے تھے ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جن معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہلِ خیر کا طریقہ مقرر کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنا قانون کی رُو سے واجب نہ ہو جائے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ مقرر ہونے کے بعد جو خطبہ دیا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"لوگو، میں تم میں سے ہی ایک آدمی ہوں۔ جو حقوق تمہارے ہیں وہی میرے لیے بھی ہیں۔ میں تمہیں تمہارے نبی کے طریقے پر چلاؤں گا اور مجھے جن باتوں کے نفاذ کا حکم دیا گیا ہے انہیں نافذ کروں گا۔"

خلیفۂ راشد پنجم جناب عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اپنے پہلے ہی خطبے میں فرمایا:

"لوگو، مجھے اس ذمّہ داری کی آزمائش میں میری رائے کے بغیر بلا طلب اور بغیر مسلمانوں سے مشورہ کیے ہوتے مبتلا کر دیا گیا ہے۔ میری بیعت کا جو قلادہ تمہاری گردن میں پڑا ہے میں اُسے خود الگ کرتا ہوں اور تم خود کسی کا انتخاب کر لو۔"

جب لوگوں نے پکار کر کہا کہ ہم آپ کو ہی صاحبِ امر تجویز کرتے ہیں تو پھر انہوں نے کہا:

"لوگو، آگاہ رہو کہ جب خالق کی نافرمانی ہو رہی ہو تو مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔

جس نے خود اللہ کی اطاعت کی اس کی اطاعت کرنا واجب ہو گیا۔ مگر جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس کی اطاعت نہیں کی جانی چاہیے۔ جب تک میں تمہارے معاملے میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری اطاعت کرو۔ مگر جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔"

دَورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے داعی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی تحریک کے قیام کے وقت منصبِ امارت کے بارے میں بڑے تاریخی الفاظ میں اسی نوعیت کے جذبات کا اظہار کیا تھا:

"میری غایتِ تمنا اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی نظامِ جماعت موجود ہو اور میں اس میں شامل ہوں۔ اسلامی نظامِ جماعت کے ماتحت ایک چپراسی کی خدمت انجام دینا بھی میرے نزدیک اس سے زیادہ قابلِ فخر ہے کہ کسی غیر اسلامی نظم میں صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب مجھے حاصل ہو۔"

اور جب جماعت نے منصبِ امارت کے لیے ان کا ہی انتخاب کر لیا تو انہوں نے فرمایا:

"میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا نہ سب سے زیادہ متقی اور نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی۔ بہر حال آپ نے جب اعتماد کر کے اس کارِ عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔ میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی پیروی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ تاہم اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو اور آپ میں سے کوئی محسوس کرے کہ میں راہِ راست سے ہٹ گیا ہوں تو مجھ پر بدگمانی نہ کرے کہ میں عمداً ایسا کر رہا ہوں، بلکہ حسنِ ظن سے کام لے اور نصیحت سے مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔ آپ کا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں اپنے آرام و آسائش اور ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمہ داریوں کو ترجیح دوں، اور میرا آپ پر یہ حق ہے کہ جب تک میں راہِ راست پر چلوں آپ میرا ساتھ دیں۔"

اسلامی تصورِ قیادت کو سامنے رکھ کر جن لوگوں نے بھی مسلمانوں کی سربراہی کی ہے ان کے احساسات و تاثرات کا بھی عالم رہا ہے۔

اسلامی مملکت کے قائدین کے نام خلفائے راشدین کی چند ہدایات: خلفائے راشدین، جو اسلامی قیادت کا رسولِ اکرمؐ کے بعد اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، انہوں نے اپنے حکام کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات دیں وہ مطلوبہ اسلامی قیادت کا اصلی

معیار ہیں۔ان کی روشنی میں بھی ہم ذمہ داری کے ہر مقام پر اپنے فرائض سرانجام دینے والی مثالی اسلامی قیادت کے معیار کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار اپنے عمال کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے حکومت کے ذمہ دارو، سربراہ کی نرمی اور بُردباری سے زیادہ نفع بخش اور خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور کوئی بُردباری نہیں ہے۔اسی طرح سربراہ کی ناسمجھی اور جذباتیت اور بے سوچے سمجھے کام کرنے سے زیادہ نقصان دہ اور ناپسندیدہ کوئی دوسری نادانی نہیں ہے۔ایک حاکم کی عیش مزاجی سے زیادہ اللہ کو کسی کی عیش مزاجی اور جہالت ناپسند نہیں ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک سپہ سالار کو روانہ کرتے ہوئے نصیحت فرمائی:۔

"اے یزید، تمہارے کچھ عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ہوسکتا ہے کہ تم ان کو کچھ ذمہ داریاں دینے میں ترجیح دینے لگو۔تمہارے لیے میرے نزدیک سب سے زیادہ اندیشے اور خوف کی بات یہی ہے۔"

حضرت عمر فاروق نے ایک خطبہ میں فرمایا:

"میں نے اپنے عمال اس لیے نہیں مقرر کیے ہیں کہ وہ تمہیں ماریں، پیٹیں، تمہاری آبروریزی کریں اور تمہارے مال ہڑپ کریں۔میں نے تو ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ تم کو تمہارے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسول کے طریقے کی تعلیم دیں۔"

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

"لوگ امیر کے حقوق اس وقت تک ادا کریں گے جب تک امیر اللہ کے حقوق ادا کریگا۔ جب امیر بے قید ہو جائے گا تو لوگ بھی بے قید ہو جائیں گے۔"

حضرت ابوموسیٰ اشعری کو ایک خط میں لکھا:

"خوش قسمت ہے وہ حاکم جس کی رعایا خوشحال ہو اور بدقسمت ہے وہ حاکم جس کی رعایا بدحال ہو۔تم اپنے آپ کو کجروی سے بچاؤ تاکہ تمہارے ماتحت کجروی نہ اختیار کریں۔"

<u>اسلامی قیادت کے چند عملی نمونے</u>| ابن خلدون نے کہا ہے کہ:

"جو حکومت عوام کے دلوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اسے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تاریخ ایسی نادر مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ جو مسلمان حکام اور قائدین کے اعلیٰ اخلاقی اسلامی اور انسانی طرزِ عمل کے بیش بہا نمونے ہیں۔ مساوات، اخوت، انسانی ہمدردی، عدل و انصاف، خدا ترسی اور احساس ذمہ داری، عوام کے سامنے جوابدہی اور خدا کے حضور پیشی کے خوف کی مثالیں بے شمار ہیں۔ ایسے نمونے دوسری اقوام کے مثالی حکمرانوں میں بھی نہیں ملتے جو ہمارے نہایت پچھلی صف کے حکمرانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں اسلامی تاریخ کے پاس غیر محدود سرمایہ ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف نمونے کے طور پر چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ابو مسعود روایت کرتے ہیں:

"میں نے اپنے ایک غلام کو کوڑا مارا، پیچھے سے آواز آئی "اے ابو مسعود! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ خدا تعالیٰ تجھ پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی تو اس غلام پر رکھتا ہے"۔

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک آواز تھی۔

"فتح مکہ کے بعد قریش کے سردار مقہور و مفتوح حضورؐ کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضورؐ کے بہترین اخلاق کے مقابلے میں بدترین طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ پتھر مارے تھے۔ اوجھیں ڈالی تھیں۔ گھر سے نکالا تھا۔ تعاقب کر کے حملے کیے تھے۔ جان لینے کے سارے جتن کیے تھے۔ حضور پر مصائب کا سارا ریکارڈ ان لوگوں کا تیار کردہ تھا۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے حضورؐ پر قاتلانہ حملے کیے تھے۔ حضورؐ کے محبوب چچا کا کلیجہ چبایا تھا۔

"اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" سوال ہوا

"ہم اپنے نیک بھائی سے نیک سلوک کی توقع رکھتے ہیں"، جھکی ہوئی گردنوں نے جواب دیا۔

"میں تم سے وہی سلوک کروں گا جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

— حضورؐ نے اپنے صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر مجھ سے کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو تو میں اس کا بدلا دینے کے لیے تیار ہوں۔ سب خاموش رہے۔ ایک صاحب بولے آپ نے صف بندی کے موقع پر ایک

بار اپنی چھڑی سے مجھے پیٹ میں ٹہوکا دیا تھا جس سے مجھے تکلیف ہوئی۔ حضورؐ نے انہیں چھڑی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم اپنا بدلہ لے سکتے ہو۔ انہوں نے کہا جب آپ نے مجھے ٹہوکا دیا تھا اُس وقت میں کرتا پہنے ہوئے نہیں تھا۔ حضورِ اکرمؐ نے یہ سن کر اپنا کُرتا اُوپر اٹھا دیا۔

— حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانے میں حضرت عمرؓ ایک اندھی عورت کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ کوئی دوسرا شخص خود ان سے بھی پہلے آکر اس عورت کا کام کر جاتا ہے۔ ایک دن وہ چھپ کر بیٹھ رہے۔ انہوں نے واپس جاتے ہوئے حضرت ابوبکر کو دیکھ لیا تو پکار اٹھے "میرا اندازہ صحیح نکلا۔ یہ تو آپ ہی ہیں۔ میری جان کی قسم آپ ہی ہیں"۔

— حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو ایک یتیم لڑکی نے کہا "افسوس اب ہماری بکریاں کون چرائے گا۔ آپ نے فرمایا "خدا کی قسم، خلافت مجھے خدمتِ خلق سے باز نہ رکھ سکے گی"۔

— آپ نے وفات کے وقت فرمایا "مسلمانوں کے مال میں سے میرے پاس ایک حبشی غلام، ایک اونٹ اور ایک پُرانی چادر ہے۔ میرے بعد یہ چیزیں عمرؓ کے پاس واپس بھجوا دینا۔ جب وہ چیزیں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچیں تو حضرت عمرؓ نے رو کر فرمایا، "ابوبکر پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے انہوں نے اپنے بعد والے کے لیے کام بہت مشکل بنا دیا ہے"۔

— حضرت عمرؓ کے دَور میں قحط پڑا تو انہوں نے دودھ گھی کا استعمال ترک کر دیا۔ زیادہ تر بھوکے رہتے، یہاں تک کہ لوگ ان کی حالت کو دیکھ کر کہنے لگے کہ اگر قحط دُور نہ ہوا تو حضرت عمرؓ کو رعایا کا غم ہلاک کر دے گا۔ اکثر کہتے رہتے "مجھے رعایا کے دکھ درد کا کیا اندازہ ہوگا اگر مجھ پر وہی کچھ نہ گزرے جو ان پر گزر رہی ہے"۔

— ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو پینے کے لیے شہد پیش کیا۔ آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں قیامت کے روز اس کو اپنے حساب میں شامل کرانا نہیں چاہتا۔

— قحط کے دوران اپنے بچے کے ہاتھ میں خربوزہ دیکھا تو اس کے پیچھے بھاگے کہ امیرالمومنین کے فرزند تم خربوزے اڑا رہے ہو اور امتِ محمد تباہ ہو رہی ہے۔ اکثر رات کے آخری حصہ میں گریہ وزاری سے دعا کیا کرتے کہ "اے اللہ اس امت کی تباہی میرے ہاتھوں نہ ہو"۔

— حضرت عمرؓ نے جب بیت المقدس کا سفر کیا تو اونٹ کی سواری کے لیے اپنے غلام سے باری

مقرر کرلی اور جب بیت المَقدس میں داخل ہوئے تو باری غلام کی تھی۔ وہ سواری پر تھا اور حضرت عمرؓ اونٹ کی نکیل تھامے آگے آگے چل رہے تھے۔

—— ایک عورت نے سر راہے روک کر کچھ کہنا چاہا۔ لوگوں نے اسے روکا تو حضرت نے فرمایا:
"اسے مت روکو، اگر یہ لوگ نہ کہیں گے تو ان میں خیر نہیں اور ہم نہ سنیں اور نہ مانیں تو ہم میں خیر نہیں"۔

—— بیتُ المال کا ایک اونٹ گم ہوگیا تو اسے ننگے پاؤں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ لوگوں نے روکنا چاہا تو فرمایا "یہ میری ذمہ داری ہے، قیامت کے دن اس کے بارے میں میری باز پرس ہوگی"۔

—— ایک مجلس میں ایک شخص نے بار بار کہا "اِتَّقِ اللّٰہَ یَا عُمر"۔ حاضرین میں سے لوگوں نے کہا کہ اب بس بھی کرو۔ بہت ہوگیا۔ تو فرمایا کہ "نہیں اسے کہنے دو، اگر یہ لوگ کچھ نہ کہیں گے تو بے مصرف ہوں گے"۔

تقویٰ اور ذمہ داری کے اس اعلیٰ معیار کے باوجود جب فوت ہو رہے تھے تو کہہ رہے تھے:۔
"خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ زمین میں جتنا سیم وزر ہے اگر وہ سارے کا سارا مجھے مل جائے تو میں ظاہر ہونے والے دن کے ہول سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے دوں گا"۔

—— حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اکثر فرمایا کرتے تھے "جو شخص اپنی جوتی آپ گانٹھ لیتا ہے، غلام کی عیادت کرتا ہے، اپنے کپڑے خود دھو لیتا ہے اور ان میں پیوند لگا لیتا ہے، وہ غرور اور تکبر سے پاک ہو جاتا ہے"۔

اور یہ کہ "جس شخص کو سال بھر تک کوئی تکلیف اور رنج نہ پہنچے وہ جان لے کہ اس کا رب اس سے ناراض ہے"۔

—— ایک شخص نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ اگر کسی شخص کو کسی مکان میں بند کرکے اس کے سارے دروازے بند کر دیئے جائیں تو اسے رزق کس طرح پہنچے گا؟ آپ نے جواب دیا کہ "جہاں سے اس کی اجل آئیگی"۔

—— حضرت علیؓ نے دو چادریں خریدیں تو اپنے غلام قنبر سے فرمایا کہ "ان دونوں میں سے اپنی پسند کی چادر تم لے لو"۔

—— حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہوئی تو انہوں نے باقاعدہ قاضی شہر کے پاس مقدمہ دائر کیا لیکن جب امیر المومنین کی پیش کردہ شہادتیں قاضی نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو صبر کے ساتھ اپنے دعوے

سے دستبردار ہو گئے۔

——حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو سابق خلیفہ کے دیئے ہوئے تمام عطیات بیت المال میں یہ کہہ کر داخل کر دیئے کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ اپنی بیوی سے، جو سابق خلیفہ کی بیٹی تھی، صاف کہہ دیا کہ "یا مجھے انتخاب کر لو یا اس سامان کو جو تمہارے پاس ہے"۔

——حضرت عمر بن عبدالعزیز سے ان کے ایک مشیر نے کہا کہ اے امیرالمومنین آپ کے دن رات کے اوقات تو بالکل رعایا کے معاملات میں ہی صرف ہو کر رہ گئے ہیں، کچھ تو آرام کر لیا کیجیے۔ انہوں نے نہایت حسرت سے جواب دیا "فرصت کہاں۔ فرصت تو اب گئی۔ اب تو صرف خدا کے ہاں ہی فرصت نصیب ہوگی"۔

——اکثر فرمایا کرتے "اگر میں سنّت کو زندہ نہ کر سکوں یا شاہراہِ حق پہ نہ چل سکوں تو ایک منٹ زندہ رہنا بھی پسند نہ کروں گا"۔

——وہ اپنے کسی قرابت دار کو کبھی عامل مقرر نہیں کرتے تھے۔ ان سے کہا کرتے "تم دیکھتے ہو کہ میرا فرش پرانا ہو چلا ہے، اگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تم اسے بھی اپنے جوتوں سے میلا کرو تو میں تم کو اپنا دین کیسے حوالے کر دوں کہ اسے علاقوں میں گرد آلود کرتے پھرو"۔

——حضرت عمر بن عبدالعزیز اکثر راتیں بے چینی میں گزارا کرتے۔ ایک رات بہت بے چینی اور اضطراب میں جاگتے اور روتے ہوئے گزاری۔ بیوی نے وجہ پوچھی تو فرمایا "میں اس قوم کے سیاہ و سفید کا مالک ہوں۔ مجھے مسافر، قیدی، غریب اور مظلوم یاد آئے۔ میں نے خیال کیا ان کے بارے میں کل خدا کے ہاں سوال ہونے والا ہے اور حضور اکرمؐ ان کے وکیل بن کر مجھ سے حجّت کریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ پھر میرا کیا بنے گا جب میرا کوئی عذر کام نہ دے گا"۔

——فرمایا کرتے "اللہ تعالیٰ خواص کی بدکاریوں کی پاداش میں عوام کو نہیں پکڑا کرتا۔ مگر جب برائیاں عام اور کھلم کھلا ہونے لگتی ہیں اور ان کے خلاف آواز نہیں اٹھتی تو سب سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں"۔

اسلام کی تعلیمات کے مطابق تیار کردہ قیادت کے یہ چند نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دنیا کا واحد نظامِ زندگی ہے جس نے اپنے نظامِ مملکت میں قیادت کے لیے صالحیت، نیکی، خدا ترسی اور پاکیزہ کردار کی شرط لگائی ہے۔ یہ قیادت کے بارے میں ایک انوکھا اور انقلابی تصور ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے اور اسلام کا یہ چیلنج دنیا کے سامنے آج بھی موجود ہے جس کا کوئی جواب دنیا کے

پاس نہیں ہے کہ اس نے انسانی فلاح و بہبود کے لیے قیادت کا جو نظریہ اور پھر اس کا جو عملی نمونہ پیش کیا ہے وہ بے مثال ہے اور آج پوری دنیا کو اسی تصوّرِ قیادت کی ضرورت ہے۔

لیکن دشواری یہ ہے کہ صالح تصوّرِ قیادت کا یہ نمونہ جب مقامِ قیادت سے ہٹ جائے اور ظالم و فاسق حکمران مسلمانوں پر جبر سے مسلط ہو جائیں تو ان سے نجات پانے کی اسلام کے نظامِ سیاست میں قابلِ عمل صورت کیا ہے؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کی طرف ایک یورپین مستشرق خاتون نے بھی ۱۹۵۷ء میں لاہور کے کلوکیم میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"ہم نے یورپ میں بُرے حاکم سے نجات پانے کا راستہ جمہوریت اور باشعور رائے عامہ کی صورت میں نکال لیا ہے۔ اسلام بُرے حاکم سے نجات پانے کے لیے آج کے جدید دَور میں کیا قابلِ عمل رہنمائی دیتا ہے اس کا جواب پوری اُمّتِ مسلمہ کے ذمّے ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس سوال کا مثبت جواب ایک اسلامی تحریک کی بھرپور جدوجہد ہی دے سکتی ہے۔

لیبیا میں شریعتِ اسلامیہ کی ہشت روزہ کانفرنس

(از جناب حبیب ریحان ندوی، لکچرر اسلامک انسٹی ٹیوٹ، بیضاء (لیبیا)

(۲)

۱۰۔ انشورنس کے سلسلہ میں فقہ اسلامی کا حکم | یہ کانفرنس کا دسواں موضوع تھا اور یہ بھی ۹ مئی کی شام ہی کا موضوع تھا لیکن ۱۰ مئی کی صبح شروع ہوا۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کسی جزوی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ ایک کُلّی نظام ہے اور اسے پُورا کا پُورا اپنانا چاہیے۔ مغربی تہذیب اور یہودی سوداگروں اور سُود خواروں کے تفصیلی نظام جو عالمِ اسلامی میں رائج ہیں ان میں علماء سے فتوے پوچھے جاتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ان کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اسلام کا اپنا بذاتِ خود ایک تعاونی نظام ہے، ایک اقتصادی نظریہ ہے، ایک تجارتی اصول ہے، ایک تکافُلی پروگرام ہے، یعنی اسلام ایک مکمل لائحہ عمل ہے۔ اخلاص کے ساتھ اگر اسلامی نظام کو اپنا لیا جائے اور پھر اسلامی نظام انشورنس یا نظام بنک کاری بنایا جائے تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن اسلامی ملکوں میں غیر اسلامی نظام و قانون پر رضامندی اور پھر مغربی یہودی نظام — سرمایہ داری — اور مشرقی یہودی نظام — مارکسیت — پر اس قدر اخلاص کے ساتھ آخر اصرار کیوں ہے؟ اور یہ مغربی و مشرقی ناسُور اسلامی ملکوں کے جسم و جان کو آخر کیوں اور کب تک گھائل بنائے رہیں گے؟ بہر حال اسلامی نظام میں یُوں بھی بیت المال سارے غریبوں، مصیبت زدوں، بیواؤں، بے نواؤں، فقیروں، مسکینوں، طالب علموں، مسافروں، اور تمام محروم افراد کی دائمی یا ہنگامی مصیبتیں دُور کرنے کا ذمّہ دار ہے، اسی ذمّہ داری کو عصر حاضر میں تفصیل کے ساتھ آگے بڑھا کر منظم تعاونی نظام بنایا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر صرف ڈاکٹر محمد السید الدّسوقی نائب رئیس تحریر، مجمع اللغۃ العربیۃ قاہرہ نے اپنا تفصیلی مقالہ پڑھا۔ آپ نے تاریخی طور پر ثابت کیا کہ یورپ میں پہلے تعاونی انشورنس تھا۔ بعد میں سود خواروں نے تجارتی انشورنس بنایا۔ ہر صورت میں یہ عقدِ غَرَر والا معاملہ تو ہے ہی، ساتھ ہی ساتھ

سود کا شبہ نہیں بلکہ یقین بھی اس میں ہے اور جوئے کی شکل بھی ہے۔ کسی ایسے اسلامی ملک میں جہاں اسلامی انشورنس کو قائم کرنے کی بات چیت نہ ہو مجبوراً اس کی بعض اقسام، حوادث وغیرہ کے خلاف کی صرف مؤقت اجازت ۔ بحکم ضرورت وحاجت ۔۔۔ دی جاسکتی ہے، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کو جائز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے بدلے انشورنس کا مکمل اسلامی نظام بنانا ضروری ہے جو اسلامی تعاون کے اصولوں پر گامزن ہو۔ دوسرے دن مباحثہ بھی اس پر طویل ہوا۔

۱۱۔ شریعت اسلامیہ میں سود کے احکام نیز لیبین مدنی، تجارتی اور بحری قوانین میں اس کی تطبیق

کانفرنس کا گیارھواں موضوع سود تھا۔ یہ جس قدر اہم ہے اسی قدر صاف ہے اور نصوص قرآنیہ ونبویہ سے بالکل واضح بھی ہے لیکن جب عقل پر ریسرچ کے پردے پڑ جائیں اور حلال چیزوں کے بجائے حرام کام مرغوب ہو جائیں تو فتنۂ نفس بشر شیطان کی قوتوں اور تفکیری صلاحیتوں سے پوری طرح مدد حاصل کرتا ہے اور الفاظ کے عجیب وغریب پھیر میں پڑ کر سیدھے سادھے اور عام معانی کو بدلنے اور غلط تاویلات کرنے پر اُبھارتا ہے۔ اور یہ سب مغرب کی تقلید اور یہودی نظامِ سود کے زیرِ اثر ہے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی نکالا جاتا ہے کہ بہت زیادہ سود لینا منع ہے لیکن تھوڑا سود لینا منع نہیں ہے، اور قرض کے سود اور تجارتی سود میں تفریق کا شاخسانہ بھی اس بحث میں چھیڑا جاتا ہے۔ یہ سب وہ انحرافات اور لاطائل بحثیں ہیں جنہیں نہ عقلِ سلیم قبول کرتی ہے نہ علم صحیح اور ایمان مستقیم۔ سود کے جو اظہر من الشمس نقصانات ہیں اور جس طرح اس کے ذریعہ قوم کا سرمایہ چند سود خوار اداروں کے پاس چلا جاتا ہے اس کا اندازہ افراد کے سود میں تو صدیوں سے ہوتا چلا آرہا تھا، اب جدید دور میں غیر ترقی یافتہ ملک جب سودی قرض لیتے ہیں اور ان کی ادائیگی کی صورت میں جن مالی اور اقتصادی پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں یہ واضح دلیل ہے کہ سود نقصان دہ ہے۔ اور پھر سود کا یہ بین الاقوامی کاروبار خالص یہود کا بنایا ہوا ہے جس سے افراد واقوام کی خستہ حالی اور دیوالیہ پن مقصود ہے۔ اور بزعم یہود یہ ان کی کتاب مقدس کی پیشین گوئی کی صداقت بھی ہے اور قوموں کو سودی کاروبار کے ذریعہ غلام بنانے کی یہ چال گویا نعوذ باللہ خدا نے ان کو سکھائی ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں "اور تو بہت سی قوموں کو قرض دیگا پر تجھ کو ان سے قرض لینا نہ پڑے گا" (استثنا ۶:۱۵)۔ ان الفاظ میں گو سود کا لفظ نہیں ہے لیکن دوسری جگہ یوں ہے "تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا۔۔ تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا" (استثناء ۲۳: ۱۹، ۲۰)۔

اس طرح کے دوسرے الفاظ بھی ہیں جن کی تشریح بعض تلمود کے حاخامات نے یہ کی ہے کہ ان الفاظ میں حضرت موسیٰ نے سود لینے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ یہ حکم ہے کہ اجنبی (غیر یہودی) کو قرض سود ہی پر دیا جائے تاکہ وہ برباد ہو۔ اور اسی لیے شریعت تلمود میں اجنبی کو بغیر سود کے قرض دینا ناجائز اور حرام ہے۔ اس سلسلہ میں حاخام شواب کا قول یہ ہے ــــ اس نے بعد میں یہودی دین ترک کر دیا تھا ــــ کہ اگر مسیحی کو کچھ پیسے کی ضرورت ہو تو یہودی کو چاہیے کہ اس کے ساتھ بار بار سود کا معاملہ کرے، حتیٰ کہ وہ اس کو ادا نہ کر سکے۔ اور اسی وجہ سے قدیم مسیحی افکار اور ڈکشنریوں اور ادب میں یہود سے مراد سود خوار اور خیانت کار لیا جاتا ہے۔ بہر حال سود ایک ایسی لعنت ہے جسے اسلامی معاشرہ سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے، اور کم از کم فوری طور پر ملک میں داخلی سود کو ختم کیا جائے۔ پھر اسلامی ملکوں کے اتحاد اور بین الاقوامی مسلم بینک کے پروان چڑھنے کے بعد خارجی سود بھی بند کیا جا سکتا ہے۔

اس اہم موضوع پر تاریخ و حقائق کی روشنی میں شیخ وقت محمد ابو زہرہ نے تفصیلی بحث کی۔ خصوصاً آیۃ الربا میں کئی بلاغی اور ادبی طریقوں سے سود کی قطعی حرمت پر توجیہات پیش کیں۔ آپ نے فرمایا سود میں اضطراب، پریشانی، فکری ناآسودگی اور ذہنی و عقلی خلجان ہوتا ہے جس کی تعبیر مسِ شیطانی سے کی گئی ہے۔ سود خور ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ سود اور تجارت میں کیا فرق ہے؟ حالانکہ سود حرام ہے اور تجارت حلال ہے۔ جو موعظت و ممانعت کے بعد سود سے باز نہ آئے اسے عذابِ نار کی وعید ہے۔ سود کے مال میں بے برکتی ہوتی ہے اور وہ مٹ جاتا ہے۔ سود خوروں کو کفر کے صیغۂ مبالغہ کفّار اور اثیم سے خطاب کیا گیا ہے۔ پھر ایمان و عملِ صالح کا تذکرہ آیت میں یہ ثابت کرتا ہے کہ سود ایمان کے منافی ہے اور عملِ غیر صالح ہے۔ نماز و زکوٰۃ کے لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس طرح یہ دین میں معلوم بالضرورۃ اور سب سے افضل فرائض ہیں، اسی طرح سود بھی معلوم بالضرورۃ اور قبیح ترین فعل ہے۔ اور جس طرح اطاعت گذاروں کو خوف اور غم سے واسطہ نہ ہوگا، اس کے برخلاف سود خور دنیا و آخرت میں خوف اور غم کا شکار رہے گا۔ تقویٰ کی علامت یہ بتائی گئی کہ سود خوری چھوڑ دے اور جو سود نہ چھوڑے وہ خدا اور رسول سے لڑائی مول لیتا ہے۔ قدیم سود کے لیے توبہ کی شرط یہی ہے کہ سود نہ لیا جائے اور صرف رأس المال واپس لیا جائے (شیخنا ابو زہرہ نے آیت میں ۶ طریقوں سے سود کی حرمت پر تبصرہ کیا تھا، یہ مضمون لکھتے وقت راقم کو کم از کم ۲۱ توجیہات سرعت کے ساتھ نظر آئیں

آیت پر مزید غور و خوض سے اور بھی نکتے برآمد ہو سکتے ہیں، بارھویں اور آخری چیز یہ ہے کہ جس طرح رأس المال واپس نہ کرنا ظلم ہے اسی طرح سُود لینا بھی ظلم ہے)۔ شیخ ابوزہرہ دوسرے موضوع "فقہ اسلامی میں بنیک کاری کے طریقے" پر بھی دوسرے دن بولنے والے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس موضوع پر بھی آج ہی گفتگو ختم کر دیتا ہوں۔ پھر بنیک کاری کے نظام کی مفصل تاریخ اور اس میں سُود کی آمیزش پر بحث کی اور اسلامی بنیک کے قیام پر زور دیا اور اس کے اصولوں کی تشریح کی اور نظامِ مضاربت پر زور دیا، اور مصر میں غیر سُودی پہلا بنیک کھلنے کا مژدہ سنایا۔ اور پھر سُود اور بنیک دونوں موضوعات پر بلا اجمال تبصرہ فرمایا۔ اختصار میں اس کی روح کو برقرار رکھنا مشکل ہے۔ بہر حال انھوں نے ہر قسم، ہر شکل اور ہر تاویل کے ذریعہ سُود کو حلال بنانے کی کوششوں کی مذمت کی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر عبدالسمیع امام پروفیسر لغتہ و دراساتِ اسلامیہ کالج، اور ڈاکٹر محمد عبدالحلیم نے بھی اپنی بحثیں سنائیں۔

۱۲۔ عقود غرر قانون میں اور فقہ اسلامی کا موقف | ۱۰ مئی کو کانفرنس کے نویں اجلاس میں ۶ بجے شام سے یہ موضوع شروع ہوا۔ غرر کے معنی دھوکہ یا خطرہ کے ہیں۔ باحثین نے بتایا کہ شریعت میں وہ تجارتی طریقے جن میں نقصان یا دھوکے کا خطرہ ہو ممنوع ہیں۔ لیکن غرر کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک غررِ فاحش ہے، یعنی خطرہ یا دھوکے کا زیادہ امکان، دوسری قسم معمولی اور کم نقصان کی شکلیں ہیں۔ ان کے جائز یا ناجائز ہونے کی تفصیلات کتبِ فقہ میں وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں۔ بعض حضرات انشورنس، قانونی جوئے وغیرہ کو غیر فاحش غرر کہہ کر جائز کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ ان میں غررِ فاحش اور کھلا ہوا نقصان یا دھوکا ہے اور دوسری بات یہ کہ اس میں دوسری وہ قباحتیں بھی موجود ہیں جن کی حرمت پہلے سے موجود ہے، جیسے سُود اور قمار۔ بہر حال یہ فقہ کا اہم باب ہے اور علّامۂ وقت شیخ علی الخفیف رکن مجمع البحوث ازہر و رکن مجمع اللغۃ العربیۃ قاہرہ اور ڈاکٹر عبدالسمیع امام نے اس پر بحث کی۔

۱۳۔ اسلامی شریعت میں دیت اور اس کی تطبیق | یہ تیرھواں موضوع تھا اور اس میں صرف اُستاد فتحی بھنسی کا مقالہ تھا، لیکن وہ اپنا یہ مقالہ صبح ہی کو قصاص کے موضوع کے ساتھ تفصیل سے سنا چکے تھے، کیونکہ قصاص اور دیت کا تعلق ایک دوسرے سے بہت قریب اور متصل ہے۔

۱۴۔ فقہ اسلامی کی روشنی میں بنیک کا نظام | طے یہ ہوا کہ اب شام کا وقت جو بچا ہے اس میں بحث و مباحثہ کے بجائے کل پڑھی جانے والی بحثوں کو پہلے مکمل کر لیا جائے اور پھر دوسرے دن شام کے آخری

اجلاس میں آخری بحث و مباحثہ کر لیا جائے ۔ سُود کی بحث کے ساتھ شیخ ابو زہرہ اس موضوع پر بول چکے تھے ۔ آج ڈاکٹر محمد احمد صَقر پروفیسر معاشیات اُردن یونیورسٹی نے بحث شروع کی ۔ آپ نے بھی شیخ ابوزہرہ کی طرح تاریخی طور پر بتایا کہ یونانی فلاسفر نے سُود کو ممنوع قرار دیا ہے ۔ یہود کے ہاں بھی اصلاً سُود حرام ہے ۔ مسیحیت میں اس کی کچھ تفصیل نہیں ہے ۔ (راقم یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہے کہ یہودیت میں سُود صرف یہودی سے لینے کی ممانعت تھی ، اور اس ممانعت سے بھی ہدیہ یا ہبہ وغیرہ کے نام سے سُود لینے کی سند یہود نے کتاب مقدس ہی سے نکال لی تھی ، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ۔ رہا غیر یہود سے سُود لینا تو یہ ان کے ہاں شرعاً جائز بلکہ واجب تھا ۔ گفتگو بائبل کی موجودہ شکل سے متعلق ہے ، اصل اور منزل من عند اللہ کتاب سے متعلق نہیں ہے ۔ مسیحیت نے سُود کی تفصیل بیان نہیں کی لیکن مال والے کا داخلہ ہی جب خدا کی بادشاہت میں منع کر دیا گیا تو پھر وہ سُود کی اجازت کیسے دے سکتا ہے ، بلکہ واپس ملنے کی امید پر قرض دینا بھی مسیحیت میں کوئی مرغوب فعل نہیں ہے (لوقا ۶ : ۳۴) ، تو پھر سُود پر واپس لینا کیسے جائز ہو سکتا ہے ۔ اسلام چونکہ وسط ہے اس لیے اس نے رأس المال واپس لینے کو غیر مرغوب قرار نہیں دیا ، نہ حلال طریقے پر مال کمانے والے کو ملکوتِ الٰہی سے خارج کیا ، بلکہ تعاون و ہمدردی اور غریبوں کو مال عطا کرنے کی تلقین بھی کی اور ساتھ ہی ساتھ سُود کی شکل میں قرض واپس لینے کو بھی ممنوع قرار دیا) ۔ ڈاکٹر صَقر نے فرمایا : جدید تہذیب میں سُود کو بڑی تقویت ملی اور ہر کام میں اس کی ضرورت محسوس کی گئی اور سُودی کاروبار بینکوں میں جاری کیا گیا ۔ مغربی بینک کاری کے دیوتاؤں کو اس بات کی شکایت ہے کہ اسلامی ملکوں میں بینک کی صحیح فکر اور سمجھ لوگوں میں پیدا نہیں ہو پاتی ۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب تک بینکوں میں سُود یعنی حرام مال کا شائبہ رہے گا ، اسلامی ملکوں میں بینک کو صحیح فروغ حاصل نہیں ہو گا ۔ ہم کیوں نہ بینکوں کو سُود کے شائبہ سے پاک کر کے اس کی بنیاد خالص اسلامی اصولوں پر رکھیں ؟ پھر انھوں نے اس نظام کی تفصیل بیان کی اور فرمایا کہ ہم ایک درہم بھی اُس طرح لینے پر تیار نہیں جس طرح خدا نے اس کو حرام کیا ہو ۔

پھر لیبین بینک کے مُدیر قسم البحوث ، استاد نوری بریون نے بھی بینک کاری کی تفصیلی تاریخ بیان کی اور آیاتِ قرآنی (طٰہٰ : ۱۱۸-۱۱۹) سے اسلامی اقتصاد کے قوانین مرتب کیے اور فرمایا کہ کھانا ، پہننا اور رہنا اصل اقتصادی ضروریات ہیں جو انسان کے لیے خدا کی طرف سے مہیا ہیں ۔ اور پانی کا تذکرہ اس لیے

نہیں کیا گیا کہ گو وہ ہوا کی طرح انتہائی ضروری ہے لیکن بظاہر اقتصادی ضروریات میں داخل نہیں۔ راقم اس سلسلے میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہے کہ پہلے تو اس آیت سے اقتصادِ اسلامی کے اصول تلاش کرنا ہی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ جنت سے متعلق ہے اور دنیا میں اُترنے کی صورت میں آگے چل کر ہدایتِ ربانی اور ذکرِ الٰہی پر چلنے کی تلقین ہے، لیکن بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا اسلامی حکومت پر واجب ہے۔ دوسری بات یہ کہ آیت میں پانی کا تذکرہ موجود ہے۔ اور اسلامی اقتصاد میں پانی اور ہوا میں بڑا فرق ہے۔ ہوا بظاہر غیر مرئی ہے اور پانی مرئی۔ اور اس لیے بارش کے قدرتی پانی اور کنوئیں سے سینچ کر کی ہوئی کھیتی کی زکوٰۃ میں بھی فرق ہے۔ جبکہ ہوا کے سلسلہ میں اس قسم کی تفرقی نہیں۔ اصل آیت شریفہ ملاحظہ ہو: (فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ. إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ. وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ)۔ پھر بریونی صاحب نے تفصیل سے مارکسی نظریہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ابن خلدون کا نظریہ زیادہ صاف اور واضح ہے، اور اسی وجہ سے وہ مارکس کی طرح چپقلش اور مصیبت میں گرفتار نہیں ہوا۔ یہ بات بریونی صاحب نے سو فیصد صحیح کہی۔ وسائلِ معیشت کے باب میں ابن خلدون کی تقسیم یُوں ہے: زمین۔ کام۔ رأس المال۔ تنظیم۔ اس بنا پر زمین اصل ہے، کام پر اُجرت ہے، رأس المال سے فائدہ ہے، اور تنظیم سے نفع ہے۔ لیکن مارکسی اصول یہ ہے کہ کام پُوری آمدنی کا اکیلا حقدار ہے جو سراسر غلط ہے۔

آخر میں آپ نے مطالبہ کیا کہ بینک کے نظام کو سُود کے شائبہ سے پاک ہونا چاہیے اور اسلامی اقتصاد کے تعاونی و تجارتی اصولوں کی روشنی میں اس کام کو ہونا چاہیے۔

۱۰۔ زکوٰۃ اور دوسرے ٹیکسوں سے اس کا تعلق ۱۱ مئی کی صبح کو دسواں اجلاس شروع ہوا۔ آج کا موضوع زکوٰۃ سے متعلق تھا۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ زکوٰۃ اسلام میں فرض اور اس کا ایک اہم رکن ہے۔ اقتصادی و اجتماعی فوائد کے علاوہ یہ ایک عبادت بھی ہے۔ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ مالداروں پر واجب ہوتی ہے جو صاحبِ نصاب ہوں اور ضرورت پڑنے پر دوسرے ٹیکس بھی لگائے جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ضروری ہوں اور ظالمانہ نہ ہوں۔ نیز زکوٰۃ کے مصارف کو قرآن نے مخصوص افراد کے لیے اور مخصوص عنوانوں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ حکومت کی دوسری ضروریات اور انسانوں کی اپنی خواہشات، جیسے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، بجلی اور پانی کی سپلائی وغیرہ کے لیے اگر دوسرے ٹیکس لگائے جائیں تو ان کا فائدہ انسان

خود ہی اٹھائیں گے۔ ایسی صورت میں زکوٰۃ کیسے معاف ہو سکتی ہے جو محتاجوں اور پریشان حالوں وغیرہ کا حق ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلامی حکومت فقیروں اور ناداروں کے نام سے جو ٹیکس لگائے اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ پہلے زکوٰۃ کی تنظیم کی جائے، اور اگر زکوٰۃ کی کامل ادائیگی اور تقسیم کے بعد ان کے مسائل پوری طرح حل نہ ہوں تو یہ اقدام کرے۔ حالانکہ یہ بات مفروضہ سے زیادہ نہیں ہے۔ زکوٰۃ کی صحیح تحصیل و تقسیم کے بعد ان کا تشفی بخش حل ہو سکتا ہے۔ پھر زکوٰۃ خدا کا حق ہے جو غریبوں کو دیا جاتا ہے۔ اسلامی نظریہ کی رُو سے سارا مال خدا کا ہے نہ کہ افراد کا اور نہ حکومتوں کا۔ غریبوں کا جو مقرر کردہ حق ہے وہ کوئی احسان نہیں ہے بلکہ فرض اور واجب ہے۔ زکوٰۃ جمع شدہ مال پر سال میں ایک بار ادا کی جاتی ہے۔ ٹیکس آمدنی پر ہوتا ہے، زکوٰۃ اس کی وجہ سے کیونکر معاف ہو سکتی ہے؟ اگر ٹیکسوں کی بہتات کی وجہ سے مال جمع ہی نہ ہو سکے تو زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر پھر بھی خرچ کے بعد جمع ہوا ہے تو اس جمع شدہ خزانے میں سے غریبوں کا حق نکالنے میں آخر پس و پیش کیسا اور کیوں ہے؟ حکومت کا طے کردہ ٹیکس ادا نہ کرنے کی جرأت نہ کرنے والوں کی یہ جرأت عجیب و غریب ہے کہ صرف مسکین و غریب کے حق کو ادا نہ کیا جائے۔ پھر زکوٰۃ کی جدید تنظیم میں کارخانوں، تجارت کے سامان اور کرایہ کے مکانات وغیرہ سب شامل کر لیے جائیں تو زکوٰۃ کی رقم بہت بڑھ سکتی ہے۔ کرایہ کے مکانات کے سلسلہ میں تین رائیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان پر زکوٰۃ نہ ہو۔ لیکن اب اس میں یہ اشکال ہے کہ جب تجارت کے مال پر زکوٰۃ ہے تو ان پر کیوں نہ ہو؟ پہلے زمانہ میں مکانات رہنے کے لیے بنائے جاتے تھے اس وقت یہ بات درست تھی۔ اب ان کی تجارتی غرض ہے۔ دوسری یہ کہ زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے؟ یا تو رأس المال پر سے تجارت کے مال کی طرح ڈھائی فیصد، لیکن اس صورت میں مالک مکان کا بہت نقصان ہے، کیونکہ مکان خالی بھی رہتا ہے اور پھر شاید سال بھر کا کرایہ اور زکوٰۃ کی رقم برابر سرابر ہی ہو جائے۔ تیسری شکل جو ازہر کی مجمع البحوث نے پاس کی ہے وہ یہ ہے کہ مکان کی آمدنی میں سے ٹیکس اور مرمت وغیرہ کی رقم نکال کر زمین کے غلہ پر قیاس کر کے دسواں حصہ نکالا جائے۔ لیکن اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ کم از کم اسلامی ملکوں میں مکان کے دوسرے ٹیکس قطعاً ختم ہونے چاہییں۔ بعض ملکوں میں مکانوں پر دس سے لے کر بیس فیصد تک ٹیکس لیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ٹیکس کے بجائے زکوٰۃ کے نام سے رقم لینا آسان ہے لیکن غیر اسلامی ملکوں میں مجموعی آمدنی میں سے جمع شدہ رقم کا ڈھائی فیصد ہی نکالا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس موضوع پر تفصیلی طور پر سوچنا ضروری ہے۔ اسلامی

ذہن بناکر لوگوں کے ذریعہ سے خود ہی زکوٰۃ کی تقسیم، اور ادا نہ کرنے کی صورت میں حکومت کی طرف سے نگرانی یا وصولی، یا بعض چیزوں کی زکوٰۃ حکومت وصول کرے اور بعض کی لوگ ادا کریں (جیسا کہ لیبیا کے جدید اسلامی قانون زکوٰۃ میں کیا گیا ہے جس کی تفصیل دوسرے موقع پر بیان کروں گا)، الغرض متذکرہ بالا تمام ہی صورتوں میں زکوٰۃ کی اس اہم اسلامی مد کے قیام اور اہتمام سے بے شمار اقتصادی فائدے ہو سکتے ہیں۔ اِس موضوع پر ڈاکٹر محمد عبدالحلیم عشری اسسٹنٹ پروفیسر لغۃ و دراسہ اسلامیہ کالج۔ اور ڈاکٹر عبدالرزاق فرج حسن نے تفصیلی گفتگو کی جو حسبِ وعدہ بعد کو پیش کی جائے گی۔

گیارھواں اجلاس ۱۱ مئی کی شام کا اجلاس تفصیلی طور پر بحث و مباحثہ کے لیے وقف تھا۔ اس مختصر رُوداد میں اس سب کی تفصیل پیش کرنی مشکل ہے۔ یہ عملی طور پر گویا کانفرنس کا آخری اجلاس تھا۔ ۱۲ مئی کے اختتامی اجلاس میں قرار دادیں پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

چند باتیں اختتامی جلسہ کی تفصیل لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہت مختصر طور پر اس کانفرنس سے متعلق چند باتیں اور متعدد واقعات درج کروں۔

احوال شخصیہ (پرسنل لا) اسلام کے عائلی قوانین کے سلسلے میں کانفرنس میں کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی کیونکہ لیبیا، مصر، شام، حتیٰ کہ سیکولر بلکہ بڑی حد تک مسیحی عربی ملک لبنان تک میں یہ مکمل طور پر باقی و جاری ہے، اور نکاح و طلاق و میراث اسلامی کو بدلنے کی ہمت باوجود کوششوں اور پروپگنڈوں کے اسلامی ملکوں میں ترکی کے سوا، کسی کو نہیں ہوئی۔ مصر میں اس سلسلہ کی طویل کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ تھوڑی سی تبدیلی، ترمیم یا تعدیل کی جرأت، جو عربی مسیحی ملک بھی نہ کر سکا، ایک مسلمان عربی ملک اور ایک مسلمان غیر عربی ملک کے عوام یا علماء نے نہیں بلکہ فرمانرواؤں نے کی ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس ترمیم کو منسوخ کیا جائے اور بین الاقوامی طور پر اس ضمانت کا مطالبہ سارے اسلامی ملک مل کر کریں کہ دنیا بھر میں مسلم پرسنل لا کا احترام کیا جائے اور اس میں ترمیم کی اجازت نہ کسی اسلامی ملک کو دی جائے اور نہ کسی غیر اسلامی ملک کو جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور باعزت زندگی گزارنا چاہتے ہوں، کسی مسلمان کے نزدیک اس کے عائلی شرعی قوانین میں تبدیلی سے بڑھ کر بے عزتی اور توہین کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ مذہب کے اعمال و احکام پر عمل کرنا انسان کا فطری حق، آزادی کا پہلا اصول اور عزت و شرف کا معیار و امتحان ہے۔

ابوزہرہ۔ مولانا مودودی اس کانفرنس میں چونکہ یہ شریعت سے متعلق تھی ائمہ اربعہ کے علاوہ تمام قدیم فقہاء وعلماء کے نام بار بار آئے، لیکن زندہ علماء میں کم از کم ۵۰-۶۰ دفعہ عالم اسلامی کے مشہور ترین فقہی عالم شیخ ابوزہرہ کا نام ان کی موجودگی میں لیا گیا۔ آپ کی ساری کتابیں فقہ اسلامی میں جدید مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح مولانا مودودی کا نام لے کر تقریباً ۴ بار حوالہ دیا گیا، اور بے نام لیے تو بار بار ان کی عبارتوں اور قانونِ اسلامی سے متعلق آراء وافکار کو نقل کیا گیا، کیونکہ مولانا نے اسلامی فکر، نظامِ اسلامی اور قانونِ اسلامی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اور پھر عام مشکلات کی نشاندہی کرکے ان کا جو حل بتایا ہے عالمِ اسلامی کے ایک بڑے گروہ نے اسے تسلیم کیا ہے۔

شیخ ابوزہرہ اور ندوہ، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا محمد عمران ندوی کا تذکرہ استاذِ محترم شیخ ابوزہرہ والدِ محترم مدظلہٗ (مولانا محمد عمران) کے استاد بھی ہیں، اور ان سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں مجھے ہمیشہ انہی کا نام لیکر یاد کرتے ہیں۔ پہلی ملاقات کے ساتھ ہی پوچھا کہ اخ عمران کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ وہ تو ندوہ ہی میں ہونگے؟ میں نے کہا، جی نہیں بھوپال میں حالات کے تقاضا کے مطابق ایک دارالعلوم کھولا ہے وہیں ہیں۔ شیخ کا حافظہ بہت پختہ ہے (اور ساتھ ہی غصہ بھی بہت شدید ہے)۔ حیرت سے کہنے لگے سید سلیمان ندوی کے ساتھ ندوہ میں ہمیشہ رہنے کا عہد وپیمان سنایا کرتے تھے (سید علیہ الرحمہ اس وقت ندوہ، دارالمصنفین اور خلافت کی وجہ سے مصر میں بہت مشہور تھے) مجھے چونکہ اس موضوع پر کچھ زیادہ صحیح تفصیلات معلوم نہیں تھیں لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ حالات کا تقاضہ یہی تھا اس لیے میں نے کہا کہ بھوپال میں ان کی سخت ضرورت تھی۔ جہاں تک ندوہ سے اخلاص، ندوہ کی فکر پر یقین اور ندوہ کے لیے کام کا تعلق ہے وہ کہیں بھی ہوں اس کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ندوہ کے جس مکین کا نام لیا وہ اب فرشِ زمین پر نہیں ہیں بلکہ زیرِ زمین آسودۂ خواب ہے۔ اور عصرِ حاضر کے سلیمانِ اعظم کا تذکرہ آپ نے کردیا مگر شبلی نعمانی کو بھول گئے۔ جس طرح شوقی، طٰہٰ حسین، غالب اور اقبال کے نام پر یونیورسٹیوں کے ادبی شعبوں میں ریسرچ ہوتی ہے (اور شبلی بھی ان ادیبوں میں شامل ہے)، اسی طرح شبلی کی دینی تعلیم کی کوششوں پر ریسرچ کا ایک شعبہ ہر اسلامی مدرسے میں کھولا جائے اور اگر تعصب وتنگ نظری کی وجہ سے سارے دینی مدارس اس تجویز کو قبول نہ کریں تو کم از کم ندوہ ہی اس پر فوراً لبیک کہے کیونکہ ندوہ کا اصولی نظریہ یہی ہے کہ وہ نہ تو متعصب ہے اور نہ شبلی کا مخالف ہی ہے۔ اور نہ شبلی کے بارِ احسان سے

وہ کسی طرح اور کسی دور میں بھی سبکدوش ہو سکتا ہے۔ ندوہ کا بانی کون تھا اور کون نہ تھا، اس فرسودہ اور فضول بحث کی بالکل ضرورت نہیں۔ یہ مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ فکری و علمی کارناموں کی وجہ سے اور ندوہ کی حقیقی انتظامی خدمت کی وجہ سے شبلی کے نام کی چیز دار العلوم ندوہ میں کھلنی چاہیے۔ کیا یہ غیر حقیقت پسندانہ بے رخی نہیں ہے کہ دوسرے اداروں میں شبلی اسکول کے نام سے تحقیق جاری ہو، شبلی نمبر نکالے جائیں مگر شبلی کا ندوہ محاسنِ شبلی اور افکارِ شبلی کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں کوئی تعمیری کام نہ کرے۔ بہرحال شبلی کے نام پر ریسرچ کا شعبہ دار العلوم کے لیے ایک ناگزیر شعبہ ہے اگر وہ ماضی سے اپنے حال کو مربوط رکھنا چاہتا ہے۔　　　(باقی)

مطبوعات

مقامِ صحابہؓ تالیف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ ناشر ادارۃ المعارف دار العلوم کراچی نمبر ۱۴۔ صفحات ۱۴۲ سفید کاغذ۔ طباعت آفسٹ۔ قیمت پونے چار روپے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا صحیح مقام بیان فرمایا ہے۔ ابتدا میں فن تاریخ اور کتب تاریخ کی اصل حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کوشش اس لحاظ سے نہایت مبارک اور مستحسن ہے کہ اسے پڑھ کر ایک عام قاری کے دل میں صحابہ کرام کے بارے میں جذباتِ عقیدت و احترام پیدا ہوتے ہیں۔

ہم اپنا یہ مقام نہیں سمجھتے کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جیسے صاحبِ نظر عالمِ دین کی توضیحات پر کوئی گرفت کریں مگر چند باتیں بڑے خلوص اور طالب علمانہ نیازمندی کے ساتھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اس حقیقت سے آخر کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ بعض صحابہؓ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی کچھ فروگزاشتیں ہوئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں باہمی اختلاف کی بنا پر تلواریں بھی نیام سے نکل آئیں۔ زیرِ نظر کتاب میں اس ضمن میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ صحابہ رضوان اللہ اجمعین سے جو کچھ ہوا اُس کے بارے میں خاموشی اختیار کی جانی چاہیے۔ کیونکہ سکوت اور کف لسان ہی شیوہ اسلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہی شیوہ اسلاف ہے تو پھر قرآن پاک اور کتب احادیث میں د تاریخ کو چھوڑ دیئے، صحابہ کے بعض تسامحات کا تذکرہ کیوں موجود ہے۔ صحابہ کے بارے میں سلف صالحین اور خلف اکابرین کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مقام کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کی (معاذ اللہ) نیت پر حملہ کرنے یا تحقیر یا تنقیص کے خیال سے قلم اور زبان دونوں کو پوری طرح روکا جائے بلکہ اُن کے بارے میں کسی قسم کی بدگمانی دماغ میں نہ لائی جائے۔ یہی شیوہ اسلاف ہے اور یہی شیوہ اخلاف بھی ہونا چاہیے۔ لیکن حدودِ احترام میں رہتے ہوئے

بیانِ حقیقت اور تفہیمِ مسائل کے طور پر کچھ کہنا نہ پہلے ممنوع تھا نہ اب ہے۔ اس ایک صحیح اور متوازن رستے سے ہٹ کر اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جائے گا تو اس سے بہت سی ایسی الجھنیں پیدا ہوں گی جنہیں سلجھایا نہ جا سکے گا، کیونکہ سلف اور خلف کے بڑے نامور بزرگوں نے تفہیمِ مسائل کے لیے صحابہ کرام کے طرزِ عمل پر بحث کی ہے اور بعض امور میں ان کی فروگزاشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

عدالتِ صحابہؓ کے ضمن میں صحابہ کرام کے لیے جس بلند مقام کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اپنی جگہ صحیح اور درست ہے اور بلاشبہ صحابہ کرام کی عظیم اکثریت اس پر پورا اترتی ہے۔ لیکن اگر اس کی بنیاد صرف اس امر کو قرار دیا جائے کہ یہ ہم تک دین پہنچانے کا واسطہ ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم تک دین پہنچانے کے بعض دوسرے واسطے بھی تو ہیں، تابعین، تبع تابعین، تبع تبع تابعین۔ ان بعد کے واسطوں کے لیے بھی جو ہم تک دین پہنچنے کے ناگزیر واسطے ہیں، کیا عدالت کا ویسا ہی بلند مقام ضروری ہے یا نہیں؟ اگر یہ ضروری ہے تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچنا چاہیے۔ اور اگر ضروری نہیں تو کیوں؟

اس کتاب کے آخر میں حضرت مفتی صاحب کی ایک "دردمندانہ گزارش" درج ہے جس کے ابتدائی فقرات پڑھ کر دل پر واقعی رقت طاری ہو جاتی ہے اور انسان موت کو سامنے کھڑا پا کر کانپ اٹھتا ہے، لیکن اس سلسلے میں ہم مفتی صاحب کی خدمت میں بصد احترام یہ عرض کریں گے کہ آخر انہیں دینِ حق کے ایک مخلص خادم اور ان کے رفیقِ کار کے بارے میں یہ کیوں بدگمانی پیدا ہو گئی ہے کہ ان کے دل صحابہ کرام کے احترام سے عاری ہیں۔ جس شخص کے دل میں ایمان کا نور ہے اس کا دل صحابۂ کرام کے احترام سے بھی معمور رہے گا۔ اگر کوئی صاحبِ ایمان احترامِ صحابہ کی ساری حدود کو سامنے رکھتے ہوئے بعض مسائل کی تنقیح میں بعض صحابہؓ کے چند ایسے تسامحات کی نشاندہی کرتا ہے جن کا تذکرہ ہمارے دینی ادب میں پہلے سے موجود ہے، اسے آخر توہینِ صحابہ کا مجرم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہمیں امید ہے محترم مفتی صاحب اس مسئلہ پر اسی دلسوزی سے غور کریں گے جس کی جھلک ان کی "دردمندانہ گزارش" میں ملتی ہے۔

صحیح لغات القرآن | تالیف: مولانا تاج محمد دہلوی۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی۔ کتابی سائز، صفحات ۴۸۸۔ کتابت، طباعت آفسٹ۔ قیمت ۵۰ ء۷ پیسے۔

قرآنِ پاک کے مفاہیم و مطالب کو بندگانِ خدا کے ذہن نشین کرنے کی ہر کوشش بجائے خود نہایت مبارک اور مستحسن ہے اور اگر ایسی کوئی کوشش فی الواقع فہمِ قرآن میں مددگار ہو تو اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ لغات القرآن اردو دان طبقہ کی سہولت کے لیے مرتب کی گئی ہے تاکہ ایک عام قاری الفاظ قرآن کے معانی اردو زبان میں سمجھ سکے۔ اس لیے الفاظ کی ترتیب بھی مادوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ حروفِ تہجی کے مطابق ہے۔ الفاظ کا ترجمہ و تشریح مستند تفاسیر کی روشنی میں کیا گیا ہے لغوی ترجمہ کے ساتھ ساتھ وہ معنی بھی دیئے گئے ہیں جو قرآن کے پیشِ نظر ہیں اور مفرد الفاظ کی جمع یا اگر جمع کا صیغہ ہو تو مفرد اور تمام صیغوں کے مصادر بتانے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

لغات القرآن بحیثیت مجموعی ایک کامیاب کوشش ہے لیکن کہیں کہیں حقِ تشریح ادا نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر کالحون کے معنی "کالے منہ، بد وضع اور بد شکل ہونے والے" کیے گئے ہیں۔ حالانکہ اس کا زیادہ صحیح مفہوم چہروں کی ایسی بھیانک ہیئت ہے جس میں ہونٹ لٹک جائیں اور کھال الگ ہو کر دانت باہر نکل آئیں۔ اسی طرح ساتھ والے صفحہ پر کاشفات کے لغوی مفہوم کے ساتھ اس کا معنیٰ و مراد "دیویاں" بتانے کی بھی ضرورت تھی تاکہ ایک عام ناظرِ قرآن کسی الجھن میں مبتلا نہ ہوتا۔

کتاب کی جزو بندی کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دی گئی۔ تبصرہ کے لیے آنے والی جلد کے صفحہ ۲۲۶ کے آگے صفحہ نمبر ۲۷۳ ملتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان خامیوں کو دور کر دیا جائے گا۔

(بقیہ اشارات)

مگر عملاً ملک میں اندھی بہری آمریت کا تسلط قائم ہے، جو یونان کے بے بصر دیوتاؤں کی طرح جو پا تی ہے کرتی ہے معمولی عہدے دار تو کیا اونچے مناصب پر فائز لوگوں کو بغیر کوئی وجہ بتائے بہ یک بینی و دوگوش ان مناصب سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ جو فرد بھی سرکارِ عالی مدار اور ان کے ہم رکاب لوگوں کے افعال اور اعمال پر کوئی معمولی سی بھی گرفت کرتا ہے اسے ایک نادر شاہی فرمان کے مطابق جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے اور اس بیچارے کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ اُسے آخر کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی جارہی ہے۔ اس پر نہ کوئی مقدمہ چلایا جاتا ہے اور نہ اسے صفائی کا کوئی موقع دیا جاتا ہے۔ پھر جیل میں بھی اُسے انتقامی کارروائیوں کا برابر ہدف بنایا جاتا ہے۔

یہ ہے اس ملک میں جمہوریت کی اصل تصویر اور برسرِ اقتدار طبقے کے جمہوریت کے دعوؤں کی حقیقت

سیاسی زندگی سے ہٹ کر جب ہم معاشی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی خلفشار کے نہایت بھیانک اور خوفناک مناظر کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مزدور کی شبِ تاریک کے خاتمے کا مژدہ جانفزا سنایا جاتا ہے اور اس کے لیے چند صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان بھی جاری ہوتا ہے لیکن یہ مژدہ سناتے وقت اور یہ اعلان جاری کرتے وقت قطعاً نہیں سوچا جاتا کہ پیدائش دولت کا عمل کوئی طلسماتی کھیل تو نہیں جسے جادو کی چھڑی سے جس وقت جادوگر چاہے کھیل لے۔ اس کے لیے حکیمانہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف تو سرمایہ کاری کا دائرہ مسلسل بڑھتا رہے اور معاشرہ بے روزگاری کی دستبرد سے محفوظ رہے اور دوسری طرف قیمتوں میں استحکام پیدا ہو کیونکہ اگر قیمتوں کی عنان کسی معاشرے کے ہاتھ سے چھوٹ جاتے تو پھر اُن کی سرکشی کو روک کر ان کے اندر اعتدال پیدا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا معاشی میدان میں پیہم بے تدبیریوں کی وجہ ہی سے جرمنی میں روزگار اور قیمتوں کے توازن کو شدید جھٹکے لگے اور خوف و ہراس کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جو بالآخر فسطائیت کے قیام پر منتج ہوئی۔ ہمارے ہاں بھی طفلانہ حرکتوں کے ذریعے معاشی زندگی کو سنوارنے کے دعوے کیے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حالات ہر لحظہ بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ کسی ملک کی سب سے بڑی معاشی

ضرورت یہ ہوتی ہے کہ ملک کے وسائل سے مکمل روزگار کی آئیڈیل کو سامنے رکھتے ہوئے بھرپور فائدہ اٹھانے کا انتظام کیا جائے مگر ہمارے ہاں اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی بلکہ سستی شہرت کے حصول کے لیے خوش کن نعروں کی بھرمار سے محنت کشوں کا دل بہلایا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ کاری کا دائرہ سکڑنے کی وجہ سے پیدائش دولت اور روزگار میں تشویشناک حد تک کمی ہو رہی ہے اور اس کے مقابلے میں اشیاء کی صرف کی قیمتوں میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے جس نے ایک نادار اور مفلس تو کیا ایک اوسط درجے کی آمدنی رکھنے والے شخص کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔

تعلیمی میدان میں بھی بڑی خوش کن تبدیلیوں کے اعلانات کیے جا رہے ہیں مگر جو شخص بھی ان آنے والی تبدیلیوں کا ذرا دقتِ نظر سے مطالعہ کرتا ہے اُس کے لیے یہ جاننا کچھ مشکل نہیں کہ اُن سے اصلاحِ احوال کی توقع کم اور خلفشار کا خدشہ کہیں زیادہ ہے اور عین ممکن ہے کہ ان تبدیلیوں سے تعلیم و تعلّم کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے بالکل معطل ہو کر رہ جائے اور فسطائیت کو تعطّل کی اس فضا میں قدم بڑھانے کے مواقع میسّر آ جائیں۔ یہ اندوہناک صورتِ حال فسطائیت کے علمبرداروں کے لیے تو خوشی اور مسرّت کا باعث ہو سکتی ہے مگر اس ملک کے حقیقی بہی خواہوں کے لیے سخت وجہِ پریشانی ہے جو اس ملک کو اس لعنت سے محفوظ و مامون دیکھنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اس ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت پسندی اور غنڈہ گردی کا تعلق ہے اس کی قہرمانیوں سے ہر شخص پوری طرح واقف ہے کیونکہ سماج دشمن عناصر کے حوصلے اب اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ وہ ہر کام بڑی دلیری کے ساتھ دن کی روشنی میں کرتے ہیں اور کوئی ان سے بازپرس کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ قتل، ڈاکہ زنی، چوری، اغوا اور اسی نوعیت کے دوسرے سنگین جرائم ہماری زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔ ان جرائم کے بڑھنے سے عوام کے اندر عدمِ تحفظ کا احساس پرورش پاتا ہے جو فسطائیت کے قیام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جو فرد اپنی زندگی اور عزت و آبرو کو محفوظ سمجھتا ہے اُس کے اندر اپنے انسانی اور شہری حقوق کے تحفظ کا احساس بھی انگڑائیاں لیتا ہے، لیکن جو شخص اپنی زندگی کو ہر لمحہ غیر محفوظ پاتا ہے وہ ایسی غلامی کو اپنے لیے بہت بڑی نعمت خیال کرتا ہے جس کا طوق پہننے سے اُس کی زندگی کا تحفظ ہو جائے۔

سید ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا۔ پرنٹر: محمد شفیع

عالمِ اسلام کی عظیم شخصیتوں کے افکار

دین یا لادینیت

ڈاکٹر محمد ناصر، سابق وزیر اعظم انڈونیشیا۔

- انڈونیشیا کی پارلیمنٹ میں مردِ مومن کا اعلانِ حق۔
- انڈونیشیا میں داخلی کشمکش کا پس منظر۔
- اِسلامی نظامِ حکومت کی پُر زور وکالت۔
- جذبۂ ایمان سے بریز

قیمت :- ۲۵-۱ روپیہ

اِسلامی حکومت میں ملازموں کے حقوق و فرائض

اور

اِسلام کا بلدیاتی نظام

پروفیسر لبیب السعید، مصر

- دورِ حاضر میں ایک جدید اسلامی ریاست چلانے کے لیے عظیم رہنمائی۔
- اسلام کے بلدیاتی نظام اور نظامِ ملازمت پر تحقیقی مقالے۔ قیمت ۲۵-۱ روپیہ

عصرِ حاضر میں

اِسلام کی زبُوں حالی

عبداللہ کنون، مراکش

- مسلمانوں کے زوال پر دردانگیز نوحہ۔
- مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ان کا حل
- نظریۂ اسلامی کے پاسبانوں کے لیے ایک قیمتی کتاب

قیمت ۸۰ پیسے

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۔ ۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

تفہیم القرآن جلد ششم

کو قارئین تک پہنچانے کے لیے پوری مستعدی سے کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن جلد بندی میں ذرا وقت لگ رہا ہے۔ تاہم جتنی تعداد میں جلدیں تیار ہو کر آ رہی ہیں وہ خریدار اور ایجنٹ حضرات کو بالاقساط ارسال کی جا رہی ہیں۔ ہماری انتہائی کوشش ہے کہ ہر آرڈر کی بروقت تعمیل کی جائے۔

ادارہ انفرادی خریدار اور ایجنٹ حضرات سے جلد ششم کی ترسیل میں تاخیر کا معذرت خواہ اور دلی تعاون کا شکر گزار ہے

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور